کیا کانگریس ناکام رہی ہے؟

۱۹۱۸ — ۱۹۳۹
کے

واقعات پر ایک تاریخی نظر

*

مسائلِ عامّہ کے ایک متعلّم کے قلم سے

*

*

دہلی
جید برقی پریس
۱۹۴۳

قیمت تین آنے

کیا کانگرس ناکام رہی ہے؟

۱۹۱۸ء - ۱۹۳۹ء کے واقعات پر ایک تاریخی تبصرہ

مسائلِ عامّہ کے ایک متعلّم کے قلم سے

فہرست مضامین

پہلا باب

مقدّمہ

اِس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ پچھلی ربع صدی میں مسٹر ایم۔ کے گاندھی ہی ہندوستان کی نمایاں ہستی بنے رہے ہیں۔ لہٰذا جب ہم اس جماعت کی کارروائیوں کا جائزہ لینے بیٹھیں جس سے ان کا نام وابستہ ہے تو لازمی طور پر بہت کچھ خود ان ہی کی کارگزاریاں اس تبصرہ کا پس منظر ہونگی۔ یہی ہستی تھی جس نے سب سے بڑھ چڑھ کر رائے عامّہ کو ڈھالا، اور ہندوستان میں سیاسی واقعات کو ایک خاص ڈھرّے پر ڈالا۔ اور ہندوستان آج سیاسی حیثیت سے جس حال میں ہے اس کی ذمّہ داری، خواہ وہ تعریف کی شکل میں ہو یا الزام کی صورت میں، دنیا اگر کسی ایک فرد پر رکھ سکتی ہے تو وہ اِنھی کی ذات ہے۔

عام طور سے ہم حال کے گذرے ہوئے واقعات سے اتنے قریب ہوتے ہیں کہ ان پر کوئی غیر جانبدارانہ رائے نہیں قائم کرپاتے ہیں۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ انسان کا حافظہ کمزور ہوتا ہے۔

حال کے واقعات پر نظر ڈالتے وقت صرف چند سال پہلے کے واقعات بھی بھول جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ ہمیشہ مفید ہوتا ہے کہ ماضی پر ایک نظر دوڑالی جائے اور اپنے زمانے کی عام زندگی کے ایک اہم باب کو صحیح زاویہ سے دیکھا جائے۔ اسی مقصد کے پیش نظر ہم چاہتے ہیں کہ پچھلی جنگ کے خاتمہ سے لے کر اس جنگ کے شروع ہونے تک یعنی کم و بیش اکیس برسوں پر جہاں تک ہو سکے واقعات کی روشنی میں نظر ڈالیں۔ اس مدت کو ہم چار نمایاں دوروں میں تقسیم کریں گے۔

اس داستان کے شروع ہونے سے پہلے غالباً ناظرین یہ معلوم کرنا چاہیں گے کہ انڈین نیشنل کانگریس کیا تھی۔ پچھلی لڑائی کے خاتمہ تک اس کا مقصد کیا تھا۔ غالباً ناظرین کی یہ خواہش بھی ہوگی کہ مسٹر گاندھی کے کردار اور ان کے مقاصد کا بھی جیسا کہ وہ اس زمانہ میں سمجھے جاتے تھے کچھ اندازہ انہیں ہو جائے

۱۹۱۸ء سے قبل کی کانگریس

مسٹر گاندھی کی مٹھی میں آنے سے پہلے کانگریس بجا طور پر یہ دعویٰ کر سکتی تھی کہ اس کے مقاصد میں وہ سب شامل تھا جو ہندوستانی قومیت کو شاہراہ ترقی پر لا سکے۔ کانگریس نے ۱۹۰۸ء میں اپنے لئے جو راہِ عمل اختیار کی تھی اس کی پہلی دفعہ حسب ذیل تھی:۔

"انڈین نیشنل کانگریس کے مقاصد یہ ہیں کہ ہندوستان کے باشندوں کو ویسا ہی طرزِ حکومت حاصل ہو جیسا کہ برطانوی

سلطنت کے دوسرے خود اختیار ممالک میں ہے۔ اور وہ
ان ممالک کے شانہ بہ شانہ رہ کر سلطنت کے تمام حقوق
و ذمہ داریوں میں برابر کا حصہ لے سکیں۔ یہ مقاصد آئینی
ذرائع سے حاصل کئے جائینگے، اس طرح کہ موجودہ نظم و
نسق میں تدریجی طور پر برابر اصلاح ہوتی رہے، اور قومی
اتحاد کو ترقی دی جائے، اور خدمتِ خلق کا جذبہ پیدا کیا جائے
اور ملک کے ذہنی۔ اخلاقی، معاشی اور صنعتی وسائل کی تنظیم کی
جائے اور اُن کو ترقی دی جائے۔

برطانوی حکومت کے ساتھ کانگریس کا جو رویہ شروع میں تھا اس کا بہترین
خلاصہ یہ ہے کہ ۱۹۱۸ء کے قریب تک کانگریس کے سالانہ جلسوں کی
کارروائیاں لازمی طور پر ہز میجسٹی ملک معظم کے چیرز پر ختم ہوتی تھیں۔
۱۹۱۸ء میں بمبئی والے جلسے میں خلاف معمول چیرز کی بجائے تین بار "بندے ماترم"
کے نعرے بلند کیے گئے!

تلک فروری ۱۹۱۵ء میں مسٹر گوکھلے کا انتقال ہوا اس وقت سے مسٹر تلک
ہندوستان کے ممتاز قومی رہنما مانے جاتے رہے اور ان کی یہ حیثیت اگست
۱۹۲۰ء یعنی ان کی وفات تک قائم رہی۔ وہ کئی حیثیتوں سے مسٹر گاندھی
کے ضد تھے۔ ان کا تعلق مہاراشٹر کے اس اعلیٰ طبقہ سے تھا جو نسلہا نسل
سے ذہنی اقتدار کا حامل رہا تھا۔ وہ ہندوستان میں برہمنوں کا تفوق چاہتے
تھے اور ہندوستان کی قسمت کی باگ ڈور برہمنوں ہی کے ہاتھ میں دیکھنا

چاہتے تھے۔ وہ ایک کٹر اونچی ذات والے تھے۔ بڑے بے ڈھرک اور چالاک لڑنے والے تھے۔ جب تک زندہ رہے وہ ارباب حکومت کے راستے کا کانٹا بنے رہے اور آخر دم تک ہندوستان کے اونچے طبقہ کے سمجھدار لوگوں پر ان کا بڑا اثر رہا۔ مسٹر گاندھی کے مخاطب عوام سیدھے سادے غیر تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ لیکن مسٹر تلک کے اقتدار کی ساری بنیاد اونچی ذات کے برہمنوں کے روایاتی اقتدار پر تھی۔ (India in 1920, Page 40.)

گاندھی ایک سماجی مصلح کی حیثیت سے

مسٹر گاندھی کے بارے میں ہم ایک مرتبہ اور پروفیسر رشبرک ولیمز کی رائے نقل کرتے ہیں:۔

"مسٹر گاندھی جن کو دنیا میں اتنی شہرت حاصل ہے کہ شاید ہندوستان کے کسی اور فرد کو حاصل نہیں، اپنی عمر کے بیشتر حصے میں اس عقیدے پر جمے رہے کہ موجودہ تہذیب ایک بھول اور غلطی ہے۔ اپنے گرو کاؤنٹ ٹالسٹائے کی طرح ان کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ جو زبردست سماجی اور معاشی نظام انیسویں صدی کی سائینسی ترقیوں پر قائم ہوا ہے، وہ اپنے اثرات کے لحاظ سے افرادِ انسانی کے لئے سخت مضر ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جو لوگ موجودہ تعلیم کا اثر قبول کرتے ہیں ان میں ایک غلامانہ ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے۔ نیز اسپتال، ڈاکٹر، عدالتیں، ریلوے اور پارلیمنٹیں۔ غرض اس تہذیب حاضر کے تمام پیچ در پیچ عناصر صرف انسان کو خدا سے دور لے جاتے ہیں۔ مسٹر گاندھی

کے نزدیک صحیح انسانی عمل کا صرف ایک ہی مقصد ہونا چاہیئے کہ روح
آزاد ہو جائے۔ نیز یہ کہ ہر وہ چیز فطرتاً بد ہے جو زندگی کی
پیچیدگی میں اضافہ کرکے آزادیِ روح کے راستے میں حائل ہو۔
مسٹر گاندھی کا عقیدہ ہے کہ فطری اور ابتدائی سادہ زندگی حاصل
کرنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے، اور وہ منحصر ہے اس پر کہ روحانی
قوت کو مادی طاقتوں پر اقتدار حاصل ہو۔ اس فطری اور ابتدائی
سادگی کو مسٹر گاندھی تمام معاشی، سیاسی اور صنعتی ترقیوں پر
مقدم خیال کرتے ہیں۔ اسی لئے انھیں مقاومتِ مجہول کا ہتھیار
اتنا زیادہ پسند ہے، خواہ اسے بدی کی قوتوں کو محبت کے ذریعہ
مغلوب کرکے قومی احیاء کے لئے استعمال کیا جائے اور خواہ ان
شکایات کے ازالے کے لئے جو رعایا کو حکومت سے ہوں، ایک
بے پناہ کل کی حیثیت سے استعمال کیا جائے ...... ایک عرصہ
تک ان کو اپنے ہندو ہم مذہبوں میں وہ اقتدار حاصل رہا ہے
جو ہندوستان میں ہر مقدس سنیاسی کو حاصل ہو جایا کرتا ہے۔ پھر یہ کہ
ان کا عقیدہ بہت کچھ قدیم ہندو طرزِ عمل سے مشابہ ہے۔ روحانی
قوت کے تفوق پر ان کا اصرار، حکومت پر اثر ڈالنے کے لئے
قومی برت کی تائید، اور مقاومتِ مجہول کی بے پناہ قوت پر ان کا
ایمان:- یہ تینوں باتیں ہندوؤں کے قدیم عقیدہ "دھرنا" پر
مبنی ہیں۔ "

گاندھی سیاست داں کی حیثیت سے

مذکورہ بالا خاکہ میں تو مسٹر گاندھی ایک سماجی مصلح نظر آتے ہیں نہ کہ سیاست داں۔ لیکن جیسے جیسے زمانہ گذرتا جاتا ہے ان کے افعال وحرکات سے یہ پتہ چلانا مشکل سے مشکل تر ہوتا جاتا ہے کہ ان کے اس فلسفہ کا آخر مقصد کیا ہے۔ یہی رائے قائم ہونے لگتی ہے کہ ان کا مقصد اپنے ہم قوموں کے احیاء سے زیادہ برطانوی حکومت کو شکست دینا ہے، اور یہ کہ جیسے جیسے ان کو قوت حاصل ہوتی گئی وہ برطانوی حکومت کی شکست کو ہی اصلی مقصد سمجھنے لگے یا کم از کم انھوں نے اسے ملک پر سیاسی غلبہ پانے کا ذریعہ بنا لیا۔

گاندھی۔ایک انسان کی حیثیت سے

مسٹر گاندھی نے اپنے اہل ملک پر جو اس قدر جلد اور اتنا پائیدار اثر جما لیا اس کی وجہ ان کا پروگرام خصوصًا ان کے رہن سہن اور خیالات کا مذہبی رنگ ہے۔ مگر ان سب سے بڑی وجہ ان کی شخصیت کی کشش ہے۔ ان کے پاس جیسے ایک جادو ہے اور شاذ و نادر ہی کوئی آدمی ایسا ہوگا جو ان سے ملے اور اس جادو کے اثر سے بچا رہے۔ اس کے اثر سے بہت سے افراد کو اُن کے ساتھ مذہبی جنون کی حد تک عقیدت ہو گئی ہے۔ غرض وجوہ کچھ بھی ہوں، مگر جو بات اس وقت اہم ہے وہ یہ ہے کہ اس وقت جب سے کہ ہماری یہ داستان شروع ہوئی ہے مسٹر گاندھی نے ہندوستان کے اندر اور ہندوستان کے باہر کروڑوں انسانوں کے دماغوں پر نہیں تو دلوں پہ تو ضرور تسلط حاصل کر لیا تھا۔ وہ تنقید سے بالاتر ہو چکے تھے۔ وہ غلطی سے مُبرّا بن گئے تھے۔ اور سب سے

بڑھ کر یہ خیال جم گیا تھا کہ انھیں کسی صورت میں بھی ناخوش نہ کرنا چاہئے۔ ایسا لیڈر اپنے پیرؤوں کے حق میں کیسی نعمت — اور بعض صورتوں میں کتنی بڑی زحمت — بن سکتا ہے۔ اس کا حال جیسے جیسے یہ داستان بڑھے گی، کھلتا جائے گا۔

گاندھی کی ہندوستان واپسی اور اس کے بعد کی سرگرمیاں

جولائی ۱۹۱۴ء میں مسٹر گاندھی نے جنوبی افریقہ کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا اور جب پہلی جنگ شروع ہوئی تو وہ انگلستان میں تھے۔ اعلانِ جنگ سے کچھ قبل ہی انھوں نے جنگ کے سلسلہ میں اپنی اور اپنے اُن رفیقوں کی خدمات جو اس وقت انگلستان میں موجود تھے غیر مشروط طور پر یہ کہہ کر حکام کو پیش کر دیں کہ "یہ ایک مخلصانہ مظاہرہ ہے ہماری اس خواہش کا کہ اِس عظیم سلطنت کی مراعات میں شرکت کے ساتھ ساتھ ہم بحیثیت رکن اس کی ذمہ داریوں میں بھی شریک رہنا چاہتے ہیں"۔ لیکن اس کے بعد ہی وہ بیمار ہو گئے اور یہ عملی تعاون نہ کر سکے۔ مگر جب وہ ۱۹۱۵ء میں ہندوستان واپس ہوئے تو انھوں نے ایک مرتبہ پھر وائسرائے کو اپنی خدمات پیش کیں اور، عراق عرب میں زخمیوں کی ڈولیاں اٹھانے اور دوسرے اسپتالی کاموں کے لئے ایک دستہ بنانے کی تجویز کی۔ لیکن ان کی یہ پیش کش لارڈ ہارڈنگ کے بقول محض اس وجہ سے نہ مانی جا سکی کہ بیرونِ ملک ان کی کسی خدمت کی بہ نسبت اس نازک موقع پر ہندوستان میں ان کی موجودگی زیادہ کارآمد ثابت ہوگی۔ ہندوستان میں اس وقت تمام تر توجہ جنگ کی طرف تھی۔ سیاسی

ہلچل دبی ہوئی تھی اور خود کانگریس معطل سی تھی۔ ہر جگہ اور ہر جماعت کی طرف سے
مسٹر گاندھی ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ حتیٰ کہ خود حکومت نے بھی ان کے جنوبی افریقہ
والے کارناموں پر اظہار پسندیدگی کے طور پر ان کو قیصر ہند کا طلائی تمغہ دیا۔
سال بھر تک ہندوستان کا دورہ کرنے اور حالات سے آگاہی حاصل کرنے کے بعد
انھوں نے سابرمتی آشرم کو جو خود انھوں نے احمد آباد میں قائم کیا تھا اپنا ٹھکانا
بنایا۔ گجرات کی سیاسی لیڈری گویا ان کی منتظر ہی تھی اور وہ فوراً عوام میں "مہاتما"
کے لقب سے مشہور ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے مقامی طور پر ستیاگرہ کے کچھ
تجربے کئے۔ ایسا ہی ایک تجربہ چمپارن میں کیا گیا جہاں ان پر مقدمہ چلایا گیا۔
اور انھوں نے اپنا طلائی تمغہ واپس کر دیا۔ دوسرا تجربہ بمبئی کے ایک ضلع کیرا
میں کیا۔ دسمبر ۱۹۱۶ء میں انھوں نے کانگریس کے اجلاس (لکھنؤ) میں
مسٹر تلک اور مسز بیسنٹ کی ہمراہی میں شرکت کی۔ مگر جنگ کے ختم
ہونے تک وہ عام طور پر جماعتی سیاست سے الگ ہی رہے۔ اگرچہ انھوں
نے دہلی میں منعقد ہونے والی ۱۹۱۸ء کی جنگی کانفرنس میں شرکت کی دعوت
اس بنا پر رد کر دی تھی کہ حکومت نے مسٹر تلک اور مسز بیسنٹ سے تعاون
کی درخواست نہیں کی تھی مگر وہ اس کے جلسہ میں شریک ہوئے اور ویسرائے
لارڈ چیمسفورڈ سے ملاقات بھی کی اور اس ملاقات سے اپنے اطمینان کا
بھی اظہار کیا۔

دوسرا باب

سنہ ۱۹۱۸ — سنہ ۱۹۲۲

سنہ ۱۹۱۷ تا سنہ ۱۹۲۱ - آئینی ترقی کی منزلیں

۲۰ اگست سنہ ۱۹۱۷ کے مشہور اعلان میں ہندوستان کے اس مطالبہ کو سرکاری طور پر مان لیا گیا کہ سلطنت برطانیہ کے جزو کی حیثیت سے اسے تدریجی ذمہ وار حکومت ملنی چاہیئے۔ اس اعلان کے بعد جو بیس سال کا زمانہ گزرا وہ جیسا کہ عموماً الزام لگایا جاتا ہے، اس وعدے کی تنسیخ میں صرف نہیں ہوا۔ بلکہ اس پوری مدت میں ہز مجسٹی کی حکومت ان موانعات کے خلاف کشمکش کرتی رہی جو اپنے وعدے کو پورا کرنے کی راہ میں تقریباً مسلسل پیش آتے رہے ہیں۔ اس اعلان کے بعد ہندستان میں مسٹر مانٹیگو کا دورہ ہوا اور اس کے بعد ہی سنہ ۱۹۱۸ میں مانٹیگو۔چیمسفورڈ رپورٹ شائع ہوئی۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۱۸-۱۹ کی سردیوں میں لارڈ ساؤتھ برو کی صدارت میں حق رائے دہی کی کمیٹی اور مفادات کی کمیٹی (Franchise and Functions committees.) قائم ہوئیں۔ لندن میں لارڈ کریو کی کمیٹی بنی۔ اس کے بعد اصلاحات کے بارے میں حکومتِ ہند کا مراسلہ مرتب ہوا۔ پھر لارڈ سلبرو کے تحت مشترکہ منتخب کمیٹی

بنی اور آخر کار ۱۹۱۹ء کا قانون حکومت ہند منظور ہوا۔ اور اخیر سال میں وہ مشہور شاہی فرمان نافذ ہوا جس کے ذریعہ قانون اصلاحات کی شاہی منظوری کا اعلان عام ہوا۔ کوئی بارہ تیرہ مہینے بعد رائے دہندوں کی نئی فہرستیں مرتب ہوگئیں اور انتخابات بھی سرانجام پا گئے۔ ۹ر فروری ۱۹۲۱ء کو ہز رائل ہائینس ڈیوک آف کناٹ نے ہندستانی پارلیمنٹ کا افتتاح کیا اور ملک معظم کا پیام سنانے کے بعد خود اپنی طرف سے بھی ہندستانیوں سے اپیل کی جسے اس کے سننے والوں میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جو بھول سکے۔ وہ اپیل یہ تھی:۔

"میں اپنی عمر کی ایک ایسی منزل میں قدم رکھ چکا ہوں جہاں پہنچ کر میری سب سے بڑی خواہش یہی ہوسکتی ہے کہ پرانے زخموں کا اندمال ہوجائے اور بچھڑے ہوؤں کو ملا دیا جائے۔ ہندستان میں جو مجھے اتنا زیادہ عزیز ہے، اپنے اس دورے کے موقع پر جو مجھے اندیشہ ہے کہ شاید یہاں کا میرا آخری دورہ ہوگا، اس نئے دارالسلطنت میں، ایک نئے آئین کا افتتاح کرتے ہوئے میں آپ حضرات سے ایک ذاتی اپیل کرنے پر مجبور ہوں۔ یہ اپیل میرے قلب کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے سیدھے سادے لفظوں میں ہوگی، آپ انھیں تنقیدی نظر اور سرد مہری سے نہ دیکھئیگا۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ غلط فہمیاں ہمیشہ دونوں طرف کی غلطیوں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ میں ہندستان کے ایک قدیم دوست

کی حیثیت سے تمام برطانویوں اور ہندستانیوں سے اپیل
کرتا ہوں کہ گزرے ہوئے زمانہ کے ساتھ ماضی کی غلطیاں اور
غلط فہمیاں بھی دفن کر دیجئے۔ جہاں معافی کی ضرورت ہو وہاں
معافی سے کام لیجئے اور ساتھ مل جل کر ان امیدوں کو سرسبز
کرنے کی کوشش کیجئے جو آج پیدا ہو رہی ہیں۔"

اگست ۱۹۱۷ء کے اعلان کو روبہ عمل لانے میں جو تین سال کا عرصہ صرف
ہوا وہ اس دس سال کے عرصے کے مقابلہ میں بہت کم معلوم ہوتا ہے جو
۱۹۲۷ء میں سائمن کمیشن کے قیام کے بعد گزرا۔ اس وقت جو اصلاحات
نافذ ہوئے ان پر جزوی عمل یکم اپریل ۱۹۳۷ء سے شروع ہوا۔ بلاشبہ
یہ اصلاحات پچھلی اصلاحات کے مقابلہ میں ایک بڑی کامیابی تھے۔ مگر ان کے
راستے میں ہر نوبت پر جو رکاوٹیں کھڑی کی گئیں، مانٹیگو، چیمسفورڈ اصلاحات
کو ان کے عشر عشیر سے بھی سابقہ نہ پڑا تھا۔

۱۹۱۸ء۔ مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ کا ردِّ عمل

یہ درست ہے کہ مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ
نے ان ہندستانی نمائندہ جماعتوں
کے اختلاف رائے کو نمایاں کر دیا تھا۔ جو اعتدال پسند لبرل پارٹی
اور انتہا پسند یا نیشلسٹ پارٹی کہلاتی تھی۔

واضح رہے کہ اس زمانہ میں کانگریس کی حیثیت کسی منظم سیاسی
پارٹی کی سی نہ تھی اور نہ اس کی کوئی باقاعدہ رکنیت تھی۔ اعتدال پسند پارٹی
چاہتی تھی کہ اس آئینی اسکیم کو اور وسیع کیا جائے مگر اس حد تک مطمئن تھی کہ

آئندہ کی سیاسی ترقی کی داغ بیل تو پڑ گئی۔ نیشنلسٹ پارٹی اس رپورٹ
اسکیم کو مایوس کن اور ناکافی سمجھتی تھی۔ رپورٹ پر غور کرنے کے لئے کانگریس کا
ایک خاص اجلاس ہوا جس میں اس اسکیم کی بڑی مذمت کی گئی اور صوبائی
خود مختاری کا مطالبہ کیا گیا۔ مگر ساتھ ہی اعتدال پسندوں سے مفاہمت کی خاطر
یہ تجویز منظور کر لی گئی کہ قانون، عدالت اور پولیس کی مدوں کو چھ سال کے لئے
امور محفوظ" ہی رہنے دیا جائے۔ لیکن اواخر ۱۹۱۸ء میں جو اجلاس دہلی
میں ہوا اس میں صوبائی خود مختاری کا فوری مطالبہ کر کے مندرجہ بالا مفاہمت
کی بنیاد ہی توڑ دی گئی۔ سال بھر بعد امرت سر میں تو انتہا پسند ذہنیت ہی
کارفرما رہی اور اعتدال پسندوں نے تو کانگریس کے اس جلسے میں شرکت کی دعوت ہی
رد کر دی۔ اور خود اپنی ایک کانفرنس کلکتہ میں کی۔

۱۹۱۹ء امرتسر کانگریس کا اجلاس

دسمبر ۱۹۱۹ء کا امرتسر والا جلسہ ایسے وقت
پر ہوا تھا کہ متذکرہ بالا شاہی فرمان بس شائع ہی ہوا تھا مگر اس جلسے میں
ان قابل قدر جذبات کا ذکر تک نہیں کیا گیا جو اس شاہی پیام میں مضمر
تھے۔ اور اسی شاہی فرمان کے ذریعہ بہت سے قیدیوں کو جو بمراحم خسروانہ معافی
دیکر رہا کیا گیا تھا اس کے لئے بھی کوئی شکریہ نہ ادا کیا گیا۔ حالانکہ ملک کے
دوسرے طبقوں پر اس کا بہت اچھا اثر ہوا تھا۔ اس جلسے میں جیسی اشتعال انگیز
تقریریں ہوئیں ویسی کبھی نہیں ہوئی تھیں۔ لارڈ چیمسفورڈ کو واپس بلا لئے
جانے کی تجویز منظور کی گئی۔ اور ایک مرتبہ تو اصلاحات کی اسکیم کو ناکافی،

پورا غیر تسلی بخش اور مایوس کن" بتا کے اس کی مذمت کی گئی۔ البتہ مسٹر مانٹیگو
کانگریس نے اصلاحات کے سلسلے میں جو محنت کی تھی اس کے لیے ان کا شکریہ ادا کیا گیا
صوبائی یہ سچ ہے کہ اس موقع پر خود مسٹر گاندھی اصلاحات مان لینے پر آمادہ تھے
کی خاطر اور چاہتے تھے کہ تجویز ملامت میں سے مایوس کن کا لفظ نکال دیا جائے اور شاہی
لیے فرمان کے وفادارانہ جواب کے بارے میں ایک دو لفظ بڑھا دیئے جائیں مگر
دہلی ان کی چلنے نہ پائی۔

مفاہمت ۱۹۲۰ء۔ گاندھی نے باگ سنبھالی

۱۹۲۰ء کے وسط تک کونسلوں
ہی کے بائیکاٹ وغیرہ کی قسم کی کوئی عملی مخالفت مسٹر گاندھی کے عدم تعاون کے
دعوتی خاص پروگرام کا خاص جزو نہ تھی۔ اگست ۱۹۲۰ء میں مسٹر تلک کے انتقال کے
ایک ماہ بعد کلکتہ میں کانگریس کا ایک خاص اجلاس طلب کیا گیا جس میں کانگریس
نے باضابطہ طور پر مسٹر گاندھی کی عدم تعاون کی تحریک کو منظور کر لیا۔ اس سال کے
ختم پر ناگپور میں سالانہ جلسہ ہوا۔ وہاں بھی میدان مسٹر گاندھی ہی کے ہاتھ رہا۔ اور
جب پنڈت مدن موہن مالویہ، مسٹر جناح اور مسٹر کھاپرڈے جیسے لیڈروں
نے مسٹر گاندھی کے پروگرام کے واقعی نتائج و عواقب سے (جو بالآخر پیش آئے)
لوگوں کو خبردار کرنا چاہا تو انھیں بولنے تک نہیں دیا گیا۔ اکثر ایسے لوگوں نے بھی
احتجاج کیا جو اس وقت تک انتہا پسندوں کی اگلی صفوں میں نمایاں جگہ رکھتے تھے۔
بہت سے ایسے ممتاز اراکین کانگریس نے استعفے دیدیئے جن کے لئے تمبر والے
جلسہ کے بعد سے کانگریس کی فضا سازگار نہ رہی تھی۔ مگر اس سارے احتجاج اور
ان تمام استعفوں کے باوجود مسٹر گاندھی نہ صرف یہ کہ اپنا عدم تعاون والا پروگرام

منظور کرانے میں کامیاب ہو گیے بلکہ طرفہ تر یہ کہ وہ کانگریس کے پرانے عقیدہ کو بدلوانے میں بھی کامیاب ہو گیے۔ کانگریس نے ابتک برطانیہ کے ساتھ وابستہ رہنے کا جو علانیہ مقصد قرار دیا تھا اور سیاسی جد و جہد کے لئے جو آئینی طریقہ اختیار کر رکھا تھا وہ سب ختم ہو گیا۔ (India 1920, page 67.)

نظر ثانی کے بعد دستور کی پہلی دفعہ حسب ذیل ہو گئی :۔

انڈین نیشنل کانگریس کا مقصد یہ ہے کہ ہندستانیوں کے لیۓ تمام جائز اور پرامن طریقوں کی مدد سے سوراج حاصل کیا جائے "

۱۹۲۱ء۔ اصلاحاتی کونسلوں کے پہلے انتخابات

اسی جلسے میں کانگریس کی چار آنہ والی ممبری کی ابتدا کی گئی اور اس کے بعد ہی سے کانگریس ایک باقاعدہ منظم سیاسی ادارے کی شکل اختیار کرنے لگی۔ نئی کونسلوں کے انتخابات کے وقت طرح طرح کی مزاحمتوں اور دھمکیوں کا سامنا رہا۔ مگر انتخابات بہر حال ہو گئے۔ جب فروری ۱۹۲۱ء میں مرکزی مجلس مقننہ کا جلسہ ہوا تو اس میں مذکورہ بالا نیشنلسٹ پارٹی یعنی کانگریس کی "سرکاری" پارٹی کا کوئی نمائندہ نہ تھا۔

یہ واقعہ ہے کہ اس سارے عرصے میں ایک مضبوط جماعت ایسے لوگوں کی رہی ہے جو یہ چاہتے تھے کہ یہ اصلاحات جیسی بھی ہوں ان کو چلایا جائے اور ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جائے۔ اس جماعت میں ایسی مشہور و ممتاز ہستیاں شامل تھیں جیسے کہ مسز بیسنٹ، ڈاکٹر سپرو اور مسٹر سریندر ناتھ بنرجی، مسٹر سرینواس شاستری۔ مسٹر چنتامنی۔ پنڈت

مدن موہن مالویہ اور سر راش بہاری گھوش۔

نئی کونسل کے اجلاس بہت ہی "تکدر فضا" میں شروع ہوئے تھے۔ مگر ابتدائی جلسے بہت کافی امید افزا ثابت ہونے لگے اور ان میں یہ عام رجحان پایا جاتا تھا کہ مزید آئینی ترقیاں آئینی ذرائع ہی سے حاصل کی جائیں۔

۱۹۱۸ء تا ۱۹۲۱ء کے سیاسی واقعات

یہاں تک تو ہم نے زیر تبصرہ مدت کے پہلے دور کی آئینی منزلوں کا حال بیان کیا۔ لیکن اس دوران میں ہندوستان میں اور کیا کچھ ہوتا رہا؟ ایک ناواقف آدمی بجا طور پر پوچھ سکتا ہے کہ "تکدر فضا" "مسٹر گاندھی کی تحریک عدم تعاون" اور "شاہی معافی اور قیدیوں کی رہائی" کے جو حوالے دیئے گئے ہیں ان کا کیا مطلب ہے؟ ان حوالوں کی تفصیل بیان کرنے کے لئے ذرا پیچھے کی طرف چلنا ہوگا۔

۱۹۱۹ء۔ رولٹ بل

اا نومبر ۱۹۱۸ء کو جنگ ختم ہو گئی تھی۔ اس کا ایک چھوٹا سا نتیجہ یہ بھی تھا کہ چھ مہینے بعد ہی ڈفنس آف انڈیا ایکٹ کی میعاد ختم ہو جاتی۔ اور اس کے بعد پھر حکومت کے پاس ایسے کوئی اختیارات باقی نہیں رہتے تھے جن کی مدد سے وہ ابتک دہشت انگیزی کی اس پالسی کی روک تھام کر سکی تھی جو جنگ شروع ہونے سے قبل بہت تیزی سے اور خوفناک طور پر بڑھتی رہی تھی۔ چنانچہ اس کمیٹی کی سفارش پر جو سر سڈنی رولٹ کی صدارت میں ۱۹۱۸ء میں بنی تھی، فروری ۱۹۱۹ء میں انڈین لیجسلیٹو کونسل میں دو بل پیش کئے گئے۔ ان میں کا پہلا بل آگے چل کر رولٹ ایکٹ کے نام سے

مشہور ہوا۔ مگر درحقیقت اس پر عمل درآمد ہونے کی کبھی نوبت نہ آئی۔ دوسرا بل ملتوی کردیا گیا اور اس نے قانون کی صورت اختیار نہیں کی۔ اس زمانے میں ایسے لوگ گنتی ہی کے تھے جو یہ سمجھ سکتے کہ رولٹ ایکٹ میں ہے کیا۔ اور آجکل شاید ایسے لوگوں کی تعداد اور بھی کم ہوگی جنھیں رولٹ ایکٹ کی دفعات کا کوئی صحیح تصور ہو۔ ان بلوں میں سے پہلے بل سے یہ مقصود تھا کہ نراجی جرائم کی جلد سے جلد تحقیقات ایک ایسی مضبوط عدالت کے ہاتھوں ہو سکے جو ہائیکورٹ کے تین ججوں پر مشتمل ہو اور جس کے فیصلوں کی اپیل نہ ہو سکے۔ یہ طریق کار صرف اسی وقت اختیار کیا جا سکتا تھا جب کہ گورنر جنرل کو اس کا اطمینان ہو جاتا کہ برطانوی ہندستان کے کسی حصے میں انقلابی قسم کے جرائم سرزد ہو رہے ہیں۔ ایسے حالات میں جبکہ گورنر جنرل کو یقین ہوتا کہ ایسی تحریکوں کو شہ دی جا رہی ہے کہ جن کی بدولت حکومت کے خلاف جرائم کے ارتکاب کے امکانات زیادہ ہو جائیں گے تو مزید اختیارات بھی حاصل کیے جا سکتے تھے۔ اس علاقے میں جہاں ایسے حالات ہوتے لوکل گورنمنٹ کو یہ اختیار ہوتا کہ ایسے لوگوں سے جن کے متعلق اس کو یقین ہوتا کہ کسی ایسی تحریک سے ان کا تعلق ہے ضمانت لے سکے، ایک خاص جگہ مقیم رہنے کی پابندی ان پر عاید کرے یا کسی خاص کام سے باز رہنے کا حکم دے۔ یہ اطمینان کرنے کے لئے کہ حکومت کے اختیارات بغیر معقول وجہ کے استعمال نہیں ہو رہے ہیں، مسودہ قانون میں ایک ایسے تحقیقاتی ادارے کی تاسیس مذکور تھی جس کا یہ فریضہ ہوتا کہ اس مواد کی جانچ پڑتال کرے جس کی بنا پر کسی شخص یا اشخاص کے بارے میں احکام نافذ

کئے جارہے ہوں۔ یہ تحقیقاتی ادارہ مشتمل ہوتا ایک عدالتی افسر اور ایک غیر سرکاری ہندستانی رکن پر۔ تیسرے یہ کہ جب گورنر جنرل کو یہ باور ہو جاتا کہ بعض جرائم کا ارتکاب اتنا بڑھ گیا ہے کہ امن عامہ خطرے میں ہے تو ایسی صورت میں لوکل گورنمنٹ کو اختیار دیا جاتا کہ ایسے لوگوں کو گرفتار کرلے جن کے متعلق یقین ہو کہ ان جرائم سے متعلق ہیں اور ان کو مقررہ جگہوں پر مقررہ حالات کے تحت نظر بند کردے۔ بل میں اس کی بھی گنجائش تھی کہ تحقیقات کی مذکورہ بالا شرائط کے تحت وہ ایسے خطرناک افراد کو مسلسل نظر بند رکھ سکے جو پہلے سے پابند یا قید ہوں۔ غرض رولٹ ایکٹ کا سارا مقصد یہ اور صرف یہ تھا کہ "ڈفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت جو غیر معمولی مشینری وجود میں آئی تھی اس کی میعاد ختم ہو جانے کے بعد بھی حکومت کے پاس ایسے اختیارات رہیں جن سے کام لے کر تخریبی تحریکوں کا مقابلہ کیا جا سکے"۔

India 1919, Page 25.)

مگر اس بل کے مقاصد کے بارے میں اس بری طرح غلط بیانی سے کام لیا گیا کہ بازاروں میں آگ کی طرح یہ افواہیں پھیل گئیں کہ اس بل کی وجہ سے لوگوں کی آدھی آمدنیاں ٹیکس میں لے لی جائیں گی۔ اور سرکار شادی غمی کی معمولی رسموں پر بھی جن سے غریب لوگوں کا خاص تعلق ہوتا ہے بڑی بڑی رقمیں جبراً وصول کرے گی۔ اس قانون کی وجہ سے لوگ بری طرح پولیس کے ظلم کا شکار بنیں گے جس کی کوئی داد فریاد نہ ہوگی۔ اور تین آدمی بھی اگر دیہات کے معاملات پر باتیں کرنے کے لئے اکٹھے ہوں تو پکڑ لئے جائیں گے۔ نیز یہ کہ زمینداروں کو

سمجھ لینا چاہیے کہ فصلیں دراصل حکومت کا مال ہیں جو ان پر بوقت ضرورت
جزوی طور پر یا کلیتہً قبضہ کرسکتی ہے۔" (India 1919, page 31.)

پہلی ستیہ گرہ کی تحریک

غرض کہ عوام کے جذبات کو اس طرح برانگیختہ
دیکھکر مسٹر گاندھی نے اسی موقع کو مقاومتِ مجہول کی اُس تحریک کا پہلی مرتبہ
بڑے پیمانے پر یہاں تجربہ کرنے کے لیے مناسب سمجھا جو وہ جنوبی افریقہ میں
اتنی کامیابی کے ساتھ چلا چکے تھے۔ کئی برس پہلے مسٹر گوکھلے نے ازراہِ احتیاط
مسٹر گاندھی سے عہد لے لیا تھا کہ وہ اپنی تحریک کو اس وقت تک نہ چلائیں گے
جب تک کہ ان کو اس کے قابلِ عمل ہونے کا پورا پورا یقین نہ ہوجائے۔ اس
موقع پر بھی مسز بیسنٹ نے مسٹر گاندھی کو نہایت سنجیدگی کے ساتھ متنبہ کر دیا
تھا کہ کسی ایسی تحریک کا جیسی کہ انھوں نے سوچ رکھی ہے یہ نتیجہ ضرور نکلے گا کہ
ایسی بے شمار قوتیں بے لگام ہوجائیں گی جن کے مضر اثرات کا تصور بھی ممکن نہیں
ہے۔ مگر مسٹر گاندھی نے ان فہمایشوں کا کوئی لحاظ نہ کیا اور فروری سنہ ۱۹۱۹ میں
اعلان کر دیا کہ اگر رولٹ بل منظور ہو گئے تو وہ اپنی قیادت میں ایک
مقاومتِ مجہول یعنی ستیہ گرہ کی تحریک شروع کر دیں گے۔ اور یکم مارچ
کو انھوں نے ایک عہدنامہ شائع کیا جس کی رو سے ہر عہد لینے والے کو
اس کا پابند کیا گیا تھا کہ ان قوانین کو نیز ایسے قوانین کو جن کو وہ کمیٹی جو بعد میں
بنائی جائے گی مناسب سمجھ کر نشان دہی کرے، ماننے سے انکار کر دیں۔
عوام کے جذبات اس درجہ مشتعل کر دیئے گئے تھے کہ تحریک کے حامیوں نے
پرجوش بیانات شائع کرنا شروع کر دیئے کہ وہ جان تک دینے کو تیار ہیں،

اور وہ بھی بقول مسز بیسنٹ "ایسے وقت میں جب کہ کوئی ذرا بھی ان کی جان لینے کا خواہاں نہ تھا" تشدد کے عناصر شمالی ہند میں نظر آنے لگے۔ مسٹر گاندھی کو تشویش پیدا ہوئی اور انھوں نے بمبئی سے پنجاب جانے کے قصد کا اعلان کردیا۔ ان کو راستے سے واپس کردیا گیا۔ افواہ اُڑ گئی کہ ان کو گرفتار کرلیا گیا ہے۔ یہ افواہ گویا نہایت افسوسناک تشدد کے مظاہروں کا اشارہ تھی۔

پنجاب کے ہنگامے اس موقع پر پنجاب کے ہنگاموں کی تفصیل نیز بمبئی اور کلکتہ کے فسادات کا پورا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف یہی کہنا کافی ہے کہ فریقین نے وہ کچھ کیا جو ان کو نہ کرنا چاہئے تھا۔ اتنا بہرحال بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ سرکاری کارروائیوں کی افسوسناک خصوصیات تو "قومی ہفتہ" کے نام سے سالانہ یادگار مناکر امتداد زمانہ گذر جانے کے بعد بھی مبالغہ آمیز طریقہ پر پیش کی جاتی ہیں، مگر عوام کی بے اعتدالیاں طاق نسیان پر رکھ دی گئی ہیں۔ ان فسادات کی تحقیقات کے لئے ہنٹر کمیٹی بٹھائی گئی تھی۔ اس کی اکثریت کی اور اقلیت کی دونوں رپورٹیں اس بات پر متفق ہیں کہ ستیہ گرہ کی تحریک ہی بہت بڑی حد تک حکومت کے خلاف ان جذبات کو بھڑکانے کی ذمہ وار تھی جو ایسے بھیانک ہنگامے کا باعث ہوئے۔ اور خود مسٹر گاندھی نے بھی اس سے انکار نہیں کیا ہے۔ انھوں نے ایک نیا لفظ ایجاد فرمایا اور اقرار کیا کہ ان سے ایک "ہمالیائی غلطی" سرزد ہو گئی ہے اور مقاومت مجہول کی تحریک ملتوی کردینے کا اعلان کردیا۔

مسٹر گاندھی نے اس کے بعد بھی بہت سی غلطیاں کی ہیں اور بعض کا انھوں نے اعتراف بھی کیا ہے۔ مگر جہاں تک یاد پڑتا ہے انھوں نے اس رنگین لفظ۔ "ہمالیائی غلطی" کو پھر کبھی نہیں دُہرایا۔

ہنگامے ختم ہوئے ہی تھے کہ ۱۹۱۹ء کے موسم گرما میں جنگ افغانستان

جنگ افغانستان چھڑ گئی۔ اگرچہ اس کے اور بھی کئی وجوہ موجود تھے مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندستان کے اندرونی فسادات کی خبر سے بھی نئے امیر کو اس ملک پر حملہ آور ہونے کی شہ ضرور ملی تھی۔

اہنسا کی طرف مراجعت ۱۹۱۹ء کے بقیہ زمانے میں مسٹر گاندھی نے اپنے آپ کو اہنسا کے پرچار کے لئے وقف کر دیا تھا۔ مگر فوراً ہی ایک نئی صورت حال پیدا ہوئی اور ایک ایسا موقع پھر پیش آیا کہ مسٹر گاندھی رک نہ سکے۔

خلافت کی ہلچل۔ ہندو مسلم اتحاد جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد مسلم رائے عامہ کو بڑی تشویش ہوئی تھی کہ فتحمند اتحادی ترکی پر کس قسم کے شرائط عائد کرینگے۔ خصوصاً یہ کہ خلیفہ کا کیا حشر ہوگا؟ ان حالات میں مسٹر گاندھی نے دیکھا کہ بقول خود ان کے "ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد کرنے کا یہ ایسا موقع ہے کہ پھر شاید سو برس تک بھی ایسا موقع ہاتھ نہ آئے" چنانچہ انھوں نے ۱۹۱۹ء کے آخر میں ایک ایسا قدم اٹھایا جس کی مثال پہلے کبھی نہیں ملتی۔ یعنی وہ خود بھی مسلمانوں کے

اس احتجاج میں شریک ہو گئے اور اس کے لیڈر بن گئے۔

سنہ ۱۹۲۰ء - عدم تعاون کی پہلی تحریک | مسٹر گاندھی کی عدم تعاون کی پہلی تحریک کے آغاز کے طور پر یہ اعلان کیا گیا کہ ۱۹ مارچ سنہ ۱۹۲۰ء کا دن ترکی کے لیئے قومی ماتم کا دن ہوگا۔ ہزاروں سادہ لوح مہاجرین کو پھسلا کر افغانستان کی طرف ہجرت پر روانہ کر دیا گیا۔ اور ایک جوشیلے مسلمان نے مسٹر ولوبی آئی سی ایس کو قتل کر دیا اور بعد کو اقرار کیا کہ اس شورش نے اس کو اس حرکت کی ترغیب دی تھی۔ مگر ان ہزاروں مہاجرین کے حشر اور مسٹر ولوبی کے قتل کے واقعہ کو پس پشت ڈال کر مسٹر گاندھی نے علی برادران کی معیت میں اپنی ساری قوت خلافت کی تحریک کے لیئے وقف کر دی۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں سنہ ۱۹۲۰ء کے ختم تک کانگریس پوری طرح ان کی مٹھی میں آ چکی تھی۔ اب رفتہ رفتہ ان کے پروگرام میں نئی نئی مدیں شامل ہونے لگیں جن کا دائرہ خطابات کی واپسی اور محاصل کی عدم ادائی سے لے کر عدالتوں، سرکاری اسکولوں اور نئی اصلاحات کے تحت قائم شدہ کونسلوں کے بائیکاٹ تک پھیلا ہوا تھا۔ مختلف نوبتوں پر خود تحریک کا دائرہ بھی وسیع تر کیا جاتا رہا۔ یہ محسوس کر کے کہ اس تحریک کو وہ اس قدر اسلامی رنگ دیتے چلے جا رہے ہیں کہ اندیشہ ہے کہ ان کے ہندو رفیق ان کا ساتھ نہ چھوڑ دیں۔ انھوں نے جون سنہ ۱۹۲۰ء میں اس تحریک کے مقاصد میں یہ ٹکڑا بھی شامل کر دیا کہ پنجاب کے ہنگاموں کے بارے میں ہندو رائے عامہ کو مطمئن کیا جائے۔ تھوڑے دنوں بعد دائرہ عمل

یہاں تک وسیع ہوا کہ "سوراج" کی طلسمی اصطلاح بھی اس میں شامل ہو گئی۔

سوراج اور اس کا مقصد اس زمانے میں اس لفظ سوراج کی کوئی قطعی تعریف پیش کرنے سے مسٹر گاندھی بڑی احتیاط کے ساتھ بچتے رہے۔ بعض لوگ یہ سمجھتے رہے کہ غالباً یہ مسٹر گاندھی کا ضبط نفس کے بارے میں کوئی اپنا تصور ہے۔ دوسرے لوگ اس کا مطلب نوآبادیاتی ہوم رول سمجھے، ایک اور طبقہ کے نزدیک اس سے مراد کامل آزادی تھی۔ کچھ ایسے بھی تھے جو اس کو اسلامی سیادت کا مرادف قرار دیتے تھے۔ سب پر طرہ یہ کہ عوام میں تھوڑے عرصہ میں "سوراج" ایک ایسے سنہرے عہد کا آغاز سمجھا جانے لگا کہ جس میں سستا سماں ہوگا۔ محصول بند ہو جائیں گے۔ کسی پر کوئی سرکاری پابندی نہ ہوگی ہر شخص آزاد ہوگا کہ اپنی املاک اور اپنے مالدار ہمسایہ کی املاک کے ساتھ جو سلوک چاہے کرے۔

کانگرس کے ستمبر ۱۹۲۰ء والے کلکتہ کے اجلاس میں مسٹر گاندھی نے اعلان کر دیا کہ "سرکاری اسکولوں، عدالتوں اور قانون ساز مجلسوں کے سہ گونہ بائیکاٹ کے ذریعہ ان کی تحریک عدم تعاون ایک سال کے اندر سوراج دلا دے گی۔ بعد کو یہ مدت ۳۰ر اکتوبر تک بڑھا دی گئی۔ پھر ۳۱ر دسمبر ۱۹۲۱ء تک اور بالآخر جب یہ مدت بھی گزر گئی تو انھوں نے نہایت مایوسی کے ساتھ اعلان فرما دیا کہ وہ "کوئی تاریخ مقرر ہی نہیں کر سکتے۔"

۱۹۲۱ء - عدم تعاون کے تشدد آمیز نتائج قصہ مختصر یہ کہ اس فضا میں فروری ۱۹۲۱ء میں اصلاحاتی کونسلوں کے اجلاس شروع ہوئے۔

مارچ ۱۹۲۱ء میں ان کے بہت سے پیرو، خصوصًا مسلمانوں میں سے، مسٹر گاندھی کے منہ سے یہ اعلان سن کر ششدر رہ گئے کہ چرخہ سوراج کی کنجی ہے! مسٹر بپن چندر پال تو فورًا اس تحریک سے دست کش ہو گئے۔ جو بقول ان کے تکلے کی نوک کے برتے ہندوستان کی آزادی حاصل کرنے چلی تھی۔

تحریک عدم تعاون کے ان نسبتًا پُرامن مظاہروں کے علاوہ مسٹر گاندھی نے دوسرے رُخ بھی اختیار کئے۔ انھیں اپنے اوپر نہایت اطمینان تھا کہ وہ اِن تمام طوفانوں پر قابو رکھ سکیں گے جن کی وہ پرورش کر رہے ہیں۔ کانگریس کے رضاکاروں اور خلافت کے رضاکاروں کو ملا کر ایک قومی رضاکاروں کی متحدہ جماعت قائم کی گئی۔ یہ ادارے دیہاتوں میں پھیلا دیئے گئے جہاں انھوں نے دیہاتیوں کے دلوں میں جو سادہ لوحی اور ناواقفیت میں ان سے کچھ ہی زیادہ تھے، مروّجہ حکومت کے خلاف نفرت پیدا کر دی۔ ہنگاموں کی لے بڑھنے لگی۔ صرف ۱۹۲۱ء میں طرح طرح کے چھوٹے بڑے کم سے کم ساٹھ ہنگاموں کی وارداتیں ملک کے مختلف حصوں میں ہوئیں۔ مئی ۱۹۲۱ء میں مسٹر گاندھی نے لارڈ ریڈنگ سے ملاقات کی جو انہی دنوں والیسرائے ہو کر آئے تھے۔ اس ملاقات کے چند ہی روز بعد علی برادران نے اپنی تقریروں کی اشتعال انگیزی کے متعلق اپنا مشہور معذرت نامہ شائع کیا۔ مگر اس کا اثر صرف چند روزہ تھا۔

علی برادران کی گرفتاری جولائی ۱۹۲۱ء میں کراچی میں جو خلافت کانفرنس ہوئی، اس میں ان دونوں بھائیوں نے اپنی اشتعال انگیز تقریروں کے

تمام پچھلے ریکارڈ توڑ دیئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ معمولی قانون کے تحت دونوں گرفتار کیے گئے، مقدمہ چلا اور سزایاب ہوئے۔

موپلوں کی شورش

اس دوران میں ہندو مسلم اتحاد میں کئی اور رخنے بھی نظر آنے لگے تھے۔ ہندوؤں کے جذبات پر خلافت کی شورش کا بار ناقابل برداشت ہوتا جارہا تھا کہ عین اسی زمانے میں یعنی اگست ۱۹۲۲ء میں موپلوں کی شورش شروع ہوئی۔ یہ ایک بے پڑھے لکھے، جوش میں اندھے لوگوں کی شورش تھی جس کو یقیناً شروع میں تو ہندو اور مسلمان دونوں طبقوں کے شورش پسندوں نے ہوا دی تھی مگر جو بعد میں خود ہندوؤں کے خلاف پلٹ پڑی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے مندر لوٹ لئے گئے، بہت سے ہندو زبردستی مسلمان بنالئے گئے اور بہت سے بے قصور لوگ موت کے گھاٹ اُتار دیئے گئے۔ ہندو مسلم اتحاد کی جو عمارت مسٹر گاندھی کے ایک مسلم مفاد کی علمبرداری کی وجہ سے وقتی طور پر تعمیر ہوگئی تھی اس کے منہدم کرنے میں دوسری تمام باتوں سے زیادہ اس الم انگیز واقعہ کا دخل ہے۔

عدم تعاون کے متعلق گورنمنٹ کی پالیسی

عدم تعاون کی ابتدائی منزلوں میں تو حکومت نے اس کے پرامن مظاہروں کے خلاف کوئی راست اقدام نہیں کیا بلکہ اسے یہ بھروسہ رہا جو آگے چل کر غلط ثابت ہوا) کہ سمجھدار رائے عامہ خود ہی اس کی مذمت کریگی بیشک بہت سے ممتاز ہندوستانی شروع ہی سے اس تحریک کے خطرات دیکھ رہے تھے۔ مگر مسٹر گاندھی کا اثر بہت زیادہ تھا۔ یوں خود مسٹر گاندھی کی آنکھیں بھی ممکنہ نتائج کی طرف سے بند نہ تھیں۔

شروع ہی میں یعنی خلافت مشن کے یادگار دورۂ پنجاب، سندھ اور مدراس کے بعد ہی انھوں نے لکھا تھا:۔ "ہمارے عام مظاہرے بلاشبہ انبوہوں کے مظاہرے ہوتے ہیں ...... کچھ بھی ہو لیکن ان میں انبوہ گردی ہوتی ہے۔ تم انبوہ کے رحم وکرم پر منحصر ہوتے ہو جب تک تم میں اور انبوہ میں ہمدردی کا رشتہ باقی ہے سب کچھ ٹھیک ہے۔ مگر جیسے ہی وہ رشتہ ٹوٹا، پھر آفت ہی آفت ہے۔" تاہم مولیوں کی شورش بھی ان کو اپنے پسند کئے ہوئے راستے سے نہ ہٹا سکی!

پرنس آف ویلز کی آمد ہز رائل ہائینس پرنس آف ویلز ۱۷ر نومبر ۱۹۲۱ء کو بمبئی پہنچنے والے تھے۔ اس مہینے کے شروع ہی میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے ہر صوبے کو اختیار دیدیا کہ سول نافرمانی یعنی مقاومت مجہول کے برعکس، چند قوانین کی عملی مخالفت شروع کر دے۔

تحریک کی ابتدا ۲۳ر نومبر کو بمقام باردولی مسٹر گاندھی کی ذاتی نگرانی میں ہونے والی تھی شاہی آمد کے موقع پر نہایت شرمناک فسادات ہوئے، جن میں ۵۳ آدمی جان سے مارے گئے اور چار سو کے قریب زخمی ہوئے۔ مسٹر گاندھی ڈھلمل ہو گئے۔ سول نافرمانی کی تحریک ملتوی کر دی گئی، اور حکومت نے اعلان کر دیا کہ عدم تعاون کی تحریک اور قومی رضاکاروں کے خلاف اور زیادہ شدید کارروائیاں کی جائیں گی۔ مسٹر گاندھی پھر بھی باز نہ رہے اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ اتنی دور نکل چکے تھے کہ اب اپنے انتہا پسند حمایتیوں کو روکنا ان کے اختیار میں نہ رہا تھا، یا شاید یہ وجہ ہو کہ انھوں نے

حکومت کی طاقت کا اندازہ غلط لگایا۔

۱۹۲۲ء - باردولی کی سول نافرمانی جنوری ۱۹۲۲ء میں سر سی سنکرن نائر کی صدارت میں ایک کانفرنس اس غرض سے منعقد ہوئی کہ حکومت اور عدم تعاون کرنے والوں کے درمیان مفاہمت کرادی جائے۔ مگر یہ کانفرنس کامیاب نہ ہوسکی۔ مسٹر گاندھی اپنی ضد پر اڑے رہے۔ فروری ۱۹۲۲ء میں انھوں نے ویسرائے کو ایک الٹی میٹم بھیجا کہ تقریر کی آزادی، جماعت بندی کی آزادی اور اخبارات کی آزادی کے بنیادی حقوق حاصل کرنے کی خاطر میری جماعت کو ناچار سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنی ہوگی۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ سب بنیادی حقوق ان کو اپنی تحریک کے شروع زمانے ہی سے برابر حاصل تھے اور جو حیثیت ان کو اسوقت حاصل تھی وہ خود اس بات کا ثبوت تھی کہ ان حقوق سے وہ کافی ناجائز فائدہ اٹھا چکے ہیں۔

اس الٹی میٹم کے جواب میں حکومت ہند نے سختی کے ساتھ تنبیہ کی کہ اگر عمومی سول نافرمانی کی کوئی تحریک چلائی گئی تو اس کے جواب میں بہت سخت اور شدید کارروائیاں کی جائیں گی۔

چوری چورا مسٹر گاندھی کے پاس یہی آخری حربہ رہ گیا تھا اور وہ باردولی میں سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنے ہی والے تھے کہ ۴ فروری کو چوری چورا (صوبہ متحدہ) میں یہ واقعہ پیش آیا کہ رضا کاروں اور دیہاتیوں کے ایک مشتعل مجمع نے اکیس پولیس کے سپاہیوں اور دیہات کے چوکیداروں کو دیدہ و دانستہ جان سے مار ڈالا۔ چوری چورا کے جیسے ہنگام

اس سے پہلے کے مہینوں میں بھی پیش آچکے تھے مگر ان سے مسٹر گاندھی کے پروگرام پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ لیکن اس موقع پر انھوں نے ایسا قدم اٹھایا جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ سول نافرمانی کو خطرناک تو ہمیشہ سے سمجھتے تھے مگر اب وہ اس کو بالکل بے سود بھی سمجھنے لگے ہیں۔

سول نافرمانی کا التواء

۱۱ اور ۱۲ فروری ۱۹۲۲ء کو باردولی میں کانگریس کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا اور اس جلسے میں مسٹر گاندھی نے سول نافرمانی کی تحریک کو فوراً ملتوی کر دیا اور اپنے ساتھیوں کو جارحانہ قسم کی تمام تیاریاں بند کرنے کی ہدایت کی۔ اس بنا پر کانگریس میں دو زبردست حریف جماعتیں پیدا ہوگئیں۔ ایک تو ان لوگوں پر مشتمل تھی جو سول نافرمانی کے التواء کو مسٹر گاندھی کا ایک اور اعترافِ شکست سمجھتے تھے۔ اور دوسری جماعت میں وہ لوگ تھے جن کا یہ عقیدہ تھا کہ اس وقت تک نہایت مستقل مزاجی کے ساتھ مسٹر گاندھی کی پیروی کرتے رہنا چاہیے جب تک کہ ان کے تمام مقصد حاصل نہ ہو جائیں۔

اس موقع پر حکومت ہند نے ایک بار اور حکومت برطانیہ کو مطلع کیا کہ ترکی کے ساتھ جو صلحنامہ صلحنامہ سیورے کے نام سے ہوا ہے اس پر نظرثانی کے بارے میں ہندوستان میں عام طور پر جذبات بہت شدید ہیں۔ جس مراسلہ میں حکومتِ ہند نے یہ خیال ظاہر کیا تھا اس کی اشاعت سے مسلمانوں پر بڑا اثر پڑا۔ اور اکثر مسلمانوں نے یہ محسوس کر لیا کہ مسٹر گاندھی کی اسکیموں کی بہ نسبت جو اب تک قطعی رائگاں رہی ہیں حکومت کی مخلصانہ کوششوں کی

تائید سے ان کو زیادہ فائدہ ہوگا۔ چند دنوں بعد باردولی والی تجویزوں کی توثیق کے لیے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ دہلی میں ہوا۔ اس موقع پر اپنے خاص خاص مقلدین میں بھی مسٹر گاندھی کا ذاتی رسوخ خاصے خطرے میں پڑ گیا۔ باردولی میں جو عام سول نافرمانی کی مخالفت کی گئی تھی اس کی توثیق کرانے میں تو بیشک وہ کامیاب ہو گئے لیکن یہ ماننے پر ان کو مجبور ہونا پڑا کہ انفرادی سول نافرمانی خواہ جارحانہ ہو یا متشددانہ۔ اب بھی صوبائی کانگریس کمیٹیوں کی اجازت سے شروع کی جا سکتی ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ عمومی سول نافرمانی ملتوی کر دی گئی تھی ترک نہ کی گئی تھی۔ اور کون کہہ سکتا تھا کہ ان کے پیرؤوں میں سے تیز مزاج طبقہ ان کو پھر ایک بار مجبور نہ کر لے گا!

گاندھی کی پہلی گرفتاری حکومت ہند نے ان کی گرفتاری کا حکم جاری کرنا طے کر لیا، چنانچہ وہ ۱۰ مارچ ۱۹۲۲ء کو گرفتار کر لیے گئے۔ ان کا مقدمہ بالکل امن اور خاموشی کے ساتھ ختم ہوا۔ ان کو چھ سال قید محض کی سزا دی گئی۔ مسٹر گاندھی نے اپنے جرم کا اعتراف کیا اور اپنے بیان کے دوران میں کہا:-

> "میں ان تمام الزاموں کی تصدیق کر دینا چاہتا ہوں جو بمبئی اور مدراس کی وارداتوں اور چوری چورا کے ہنگامے سے متعلق ایڈووکیٹ جنرل نے مجھ پر لگائے ہیں۔ میں نے ان معاملات پر بہت غور کیا ہے اور کئی راتیں اسی دھن میں کاٹی ہیں اور اپنے قلب کا جائزہ لیتا رہا ہوں۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میرے لئے یہ قطعی غیر ممکن ہے کہ چوری چورا کے ابلیسانہ جرائم

یا بمبئی کے مجنونانہ تشدد سے اپنے آپ کو بری کر سکوں۔ ان
کا (ایڈووکیٹ جنرل کا) یہ کہنا بالکل درست ہے کہ ایک ذمہ دار
انسان کی حیثیت سے، ایک کافی تعلیمیافتہ شخص کی حیثیت سے
جسے اس دنیا کا بھی کافی تجربہ ہے مجھے اپنے ہر فعل کے نتائج کا
علم ہونا چاہئے تھا۔ مجھے یہ سب علم تھا۔ میں جانتا تھا کہ میں
آگ سے کھیل رہا ہوں، مگر میں نے یہ خطرہ مول لیا' اور
اگر مجھے آزاد کر دیا جائے تو میں پھر بھی وہی کرونگا۔"

(الفاظ کے نیچے خط ہم نے کھینچا ہے ۱۲ مصنف)

تیسرا باب

۱۹۲۲ء ـ ۱۹۲۷ء

ہمارے موضوع بحث کا دوسرا جز ساڑھے پانچ سال کی وہ مدت ہے جو مارچ ۱۹۲۲ء میں مسٹر گاندھی کی پہلی گرفتاری سے لے کر نومبر ۱۹۲۷ء میں سائمن کمیشن کے اعلان پر ختم ہوتی ہے۔ اس ساڑھے پانچ سال کے عرصے میں اگرچہ پچھلے چار سال کی سی گہما گہمی نہیں ہوئی۔ مگر سیاسی اور دستوری نقطۂ نظر سے بہت سے دلچسپ واقعات پیش آئے۔

۱۹۲۲ء تا ۱۹۲۴ء۔ گاندھی کی رہائی اور نیم گوشہ نشینی

اپنڈکس کے ایک کامیاب آپریشن کے بعد ۵ فروری ۱۹۲۴ء کو مسٹر گاندھی چھوڑ دیئے گئے۔ اس کے بعد چند سال تک سوائے چند خاص خاص موقعوں کے جب کہ وہ پبلک سٹیج پر آئے وہ تقریباً گوشہ نشین رہے، البتہ ۱۹۲۸ء میں وہ پھر ہندوستانی سیاست کی دنیا پر ایک طوفانی ہستی بن گئے۔ اس دوران میں سیاسی سرگرمیوں کا مرکز دیہاتوں سے منتقل ہو کر قانون ساز مجلسوں میں آ گیا تھا۔ کونسلوں کی شرکت کے متعلق مسٹر گاندھی کی ممانعت کے باوجود ۱۹۲۳ء کے اخیر میں جب انتخابات ہوئے تو ایک زبردست کانگرسی جتھا (سوراج پارٹی) مرکزی مجلس مقننہ میں آ گیا۔ جیسے ہی غیر آئینی رخنہ اندازوں

تعاون میں اضافہ کے لیڈر مسٹر گاندھی سیاسی اسٹیج سے ہٹے، ان کی جگہ مسٹر سی۔ آر۔ داس اور پنڈت موتی لال نہرو نے لے لی تھی۔ اور کم از کم پنڈت موتی لال نہرو کی حیثیت حزب مخالف کے ایک آئینی لیڈر کی سی تھی۔ علاوہ بریں اگرچہ کانگرسی نمایندے قانون ساز مجلسوں میں اس ارادے سے آئے تھے کہ اصلاحات کو درہم برہم کر دیں گے" لیکن، اور یہ ایک اہم واقعہ ہے، سوا بنگال اور صوبہ متوسط کے انھوں نے کہیں بھی اپنا ارادہ پورا نہیں کیا۔ بلکہ اصلاحات کو آئینی طور پر چلانے کے لیے ڈٹے رہے۔ اس میں شک نہیں کہ کچھ عرصہ بعد خود سوراج پارٹی میں اختلافات پیدا ہوگئے۔ اور ایک نئی پارٹی بنی جس میں بہت سے ممتاز سوراجیے شریک تھے جو جوابی تعاون کا عہد کر چکے تھے۔ رخنہ اندازانہ قوتوں کو دوبارہ برسرِ کار آنے کا موقع صرف ۱۹۲۷ء میں سائمن کمیشن کے تقرر کے اعلان کے بعد ملا۔

عدم تعاون کے عواقب عدم تعاون کی تحریک نے دو بڑے نہایت ورثے چھوڑے تھے۔ سیاسی تحریک کی حیثیت سے تو وہ یقینی ناکام رہی تھی، لیکن ایک ذہنی رجحان کی شکل میں زندہ رہی اور ہر غیر جانبدار شخص نے دیکھ لیا کہ اس سارے عرصہ میں اس تحریک کی بدولت کیسی کیسی ناکامیاں اور مایوسیاں ہوئیں۔ مسٹر گاندھی کے عقیدتمندوں میں ایک مستقل جماعت ایسے لوگوں کی رہی جو کسی تبدیلی کے لیے تیار نہ تھے۔ بحیثیت لیڈر اب تک مسٹر گاندھی کی نازبرداری اس حد تک ہوتی تھی کہ ان کے مزاج کے خلاف کوئی بات ہونے ہی نہ پاتی تھی۔ ایسے لوگ بھی تھے جو دل سے تو مسٹر گاندھی کے طریقۂ کار کو ناپسند کرتے تھے لیکن اُن کو ہمیشہ یہی دھڑکا

لگا رہتا تھا کہ اگر ان پر حکومت کے ساتھ تعاون کرنے کا شبہ بھی ہو گیا ۔ خواہ یہ تعاون کتنے ہی مفید کام کے لئے کیوں نہ ہو ۔ تو ان کی سیاسی شہرت خاک میں مل جائے گی ۔ یہ ایک ایسا خوف تھا جس میں کیا اعتدال پسند کیا ۔ انڈیپنڈنٹ حتیٰ کہ خود سوراج پارٹی کے بہت سے اراکین مبتلا تھے ۔

فرقہ وارانہ مخالفت کی نشوونما دوسرا ورثہ جو عدم تعاون کی تحریک نے چھوڑا وہ فرقہ وارانہ مخالفت ہے ۔ مسٹر گاندھی کی تحریک نے بے چینی اور بے اطمینانی پیدا کر دی تھی اور اس کی دو صورتیں تھیں ۔ سلبی طور سے تو یہ کہ مسٹر گاندھی نے تو بڑی انتھک محنت کی کہ حکومت کا اقتدار جاتا رہے مگر اسی کوشش میں انھوں نے اس واحد قوت کو کمزور کر دیا جو انسانوں کو فرقہ وارانہ تعصبات سے بالاتر بنا سکتی تھی ۔ .... ایجابی طور سے تحریک عدم تعاون کا اثر اور بھی خطرناک ہوا ۔ مسٹر گاندھی نے محض اندرونی سیاسی مقاصد حاصل کرنے کی خاطر خلافت کے مسئلہ پر انتہا پسند مسلمانوں کی ہم آہنگی کر کے ہندوستانی مسلمانوں اور بیرون ہند کی اسلامی دنیا کے مابین رشتۂ ارتباط کی علمبرداری کی اور اس سے خوب ناروا فائدہ بھی اٹھایا ۔ مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کے لئے مسٹر گاندھی کا مسلک یہ تھا کہ "مذہب پہلے اور سب چیزیں بعد میں" انھوں نے یہ سبق پڑھائے کہ موجودہ حکومت شیطانی ہے، اور مذہبی معتقدات کے بارے میں نہ تو تبدیلی کی گنجائش ہوتی ہے نہ کسی لین دین کی ۔ چنانچہ شروع میں حکومت

کے خلاف فرقہ وارانہ جذبات خوب مشتعل ہوئے۔ مگر مولاؤں کی
ہیبت ناک شورش نے ہندوؤں کے سامنے وہ خطرہ پیش
کر دیا جس کو وہ عارضی طور پر بھول گئے تھے۔ دونوں فرقوں کے درمیان
سیاسی اتحاد کمزور پڑ گیا، اور ہندوستان کے باہر جو واقعات
رونما ہوئے انھوں نے تو اس کا بالکل ہی خاتمہ کر دیا۔ ہوا یہ کہ ترکی
اور اتحادیوں کے مابین متفقہ شرائط پر صلح ہو گئی، اور کچھ ہی دنوں
بعد ترکوں نے پہلے تو سلطان خلیفہ کو تمام دیوانی اختیارات سے محروم
کر دیا، اور پھر خلافت ہی کا قلع قمع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں
تشدد دلیسندی کا جو جذبہ دیدہ و دانستہ پیدا کر دیا گیا تھا اس میں
سے حکومت کی مخالفت کا عنصر فوراً زائل ہو گیا۔ یہ بات ظاہر ہو گئی کہ
مسٹر گاندھی نے خلافت کے مسئلہ میں کوئی حقیقی مدد نہیں کی تھی۔ کیونکہ ان کی
کوشش کے باوجود وہ ادارہ ہی ختم ہو گیا جس کے لئے جذبات کو اتنا ابھارا
گیا تھا۔ اب ایک ردِ عمل شروع ہوا۔ ہندوستانی مسلمانوں کی نظریں
بیرونی معاملات سے ہٹ کر اندرونِ ملک کے مسائل پر پڑنے لگیں۔
یہاں انھوں نے جو کچھ دیکھا اس نے انھیں سہما دیا۔ اپنی سات کرور
تعداد کے باوجود وہ پھر بھی ہندوؤں کے مقابلہ میں ایک اقلیت
تھے۔ نیز یہ کہ اگرچہ وہ عسکری روایات کے حامل تھے اور ان کے
دلوں میں اپنی ہندوستانی سلطنت کی یاد اب تک تازہ تھی، مگر تعلیم،
دولت اور کاروبار کے معاملے میں اب وہ اپنے حریفوں سے کمتر تھے۔

اگر سوراج مل گیا تو ان کا کیا حشر ہوگا؟ یہ سوال ان کے ذہن میں پیدا ہوا۔ فرقہ وارانہ تشویش بڑی تیزی سے بڑھتی گئی، اور انھوں نے ایسے مطالبے پیش کیے جن سے ہندو کبھی تو برانگیختہ ہوتے اور کبھی گھبرانے لگتے۔ تھوڑے ہی دنوں میں صورت حال واضح ہوگئی۔ مسلمانوں نے طے کر لیا تھا کہ وہ اس وقت تک سوراج کی جانب ایک قدم بھی نہ بڑھائینگے جب تک کہ ان کے اپنے مستقبل کی ضمانت نہ ہو۔ چونکہ مسٹر گاندھی نے ایک تو اس نظریہ کی خوب تبلیغ کی تھی کہ ہر شخص کے لئے سب سے زیادہ اہم چیز اس کا مذہب ہی ہوتا ہے، اور دوسری طرف دنیاوی اقتدار کو قابلِ لعنت و ملامت ٹھہرایا تھا، اس لئے قدرتی طور پر مسلمانوں نے اپنے مذہب کے احکام کو، جن میں عسکری تنظیم کا خاص عنصر موجود ہے، اپنا سہارا بنایا۔ ادھر ہندوؤں کی طرف سے بھی اسی روش کا اظہار ہونے لگا، کیونکہ ان کی آنکھیں مولاؤں نے اسلام کے نام پر جو دہشت انگیزیاں کی تھیں اُن سے اچھی طرح کھل گئی تھیں۔ اب مسٹر گاندھی کی پالیسی کے عواقب پہلی مرتبہ پوری طرح ظاہر ہوئے۔ انھوں نے تاریخ کی طرف سے آنکھیں بند کرکے لوگوں کو یہ سبق سکھایا تھا کہ اللہ کو تو افضل مانو لیکن حاکمِ وقت پر لعنت بھیجو۔ حالانکہ ہندوستان کے متعلق تو کسی نے خوب کہا ہے کہ "یہاں حاکمِ وقت تو ایک ہی ہوتا ہے" خدا البتہ کئی کئی شکلوں میں پوجا جاتا ہے۔ اور صرف حاکمِ وقت کی روک تھام ہی سے اس کے

بندے باہمی رواداری کے اصول پر قائم رہتے ہیں۔ لہٰذا بدیہی بات تھی کہ مسٹر گاندھی کے نظریے کی بدولت ہندوستان کو امن تو نصیب نہ ہو سکا لیکن ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کے لئے اس بدنصیب ملک کے ہاتھ تلوار ضرور آگئی۔"

(India 1924—25, Page 299)

مسلم لیگ اور ہندو مہاسبھا

اس باب میں جو زمانہ زیر نظر ہے اس کی خاص بات یہ ہے کہ ادھر مسٹر جناح کی رہبری میں مسلم لیگ کا پہلا احیاء ہوا، اور ادھر ہندو مہاسبھا ایک علانیہ فرقہ وارانہ جماعت کے روپ میں رونما ہوئی۔ اس دور میں ان دونوں بڑے فرقوں کے درمیان مفاہمت کی کئی متعدد کوششیں ہوئیں، اتحاد کانفرنسیں ہوئیں، اور مسٹر گاندھی نے برت رکھا، مگر فرقہ وارانہ اختلافات میں برابر زیادتی ہوتی گئی، اور ہندو مسلم فسادات آئے دن زیادہ ہی ہوتے رہے۔

۱۹۲۳ء۔ گیا کانگریس، گاندھی کا اثر حسب دستور رہا

مسٹر گاندھی کی گرفتاری کے بعد عدم تعاون کی عظیم الشان تحریک جو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ امن و قانون کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکے گی، چند ہی مہینوں میں متصادم مفادات اور اختلافات رائے کا گڑبڑ جھالا بن کر رہ گئی۔ جون ۱۹۲۲ء میں لکھنؤ کے کانگریس کمیٹی اور خلافت کمیٹی کے جلسوں میں، اور اسی سال کے ختم پر بمقام گیا کانگریس کے اجلاس میں، مسٹر گاندھی کا اثر ہی غالب رہا۔ یہ تو طے ہو گیا کہ تعمیری

جاری رکھا جائے، لیکن یہ کوشش نہ چلنے پائی کہ کانگریسی ممبروں کو کونسلوں میں شریک ہونے کی اجازت دی جائے۔ میدان اب بھی انھی لوگوں کے ہاتھ رہا جو کسی وقت بھی کسی تبدیلی کے لئے آمادہ نہ تھے۔ تاہم ان کانگریسی لیڈروں نے، جنھوں نے سول نافرمانی کی تحقیقات میں حصہ لیا تھا اپنی رپورٹ میں بالاتفاق یہ رائے دی کہ ملک بھر میں عام سول نافرمانی جاری کرنا قطعی غیر ممکن ہے۔ اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی پانچ روز کی گرما گرم بحث کے بعد بھی ان کی رپورٹ کے متعلق کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکی۔

۱۹۲۳ء۔ کونسلوں میں شرکت سوراج پارٹی کی ابتدا

پہلی جنوری ۱۹۲۳ء کو کانگریس کے خلاف بغاوت شروع ہوگئی۔ یعنی مسٹر سی۔ آر۔ داس، پنڈت موتی لال نہرو، مسٹر اجمل خاں اور بعض دوسرے ممتاز لیڈروں نے یہ اعلان کر دیا کہ انھوں نے کانگریس کے اندر ہی ایک نئی خلافت۔ سوراجیہ پارٹی قائم کی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ مخالفین کو عدم تعاون کے پروگرام میں کچھ تبدیلیاں کرنے پر راضی کریں۔ اس دوران میں رائٹ آنریبل مسٹر سرینواس شاستری کی صدارت میں نیشنل لبرل فیڈریشن، اور مسز بیسنٹ کی طلب کی ہوئی ایک کانفرنس سر تیج بہادر سپرو کی صدارت میں آئینی ترقی کے پروگراموں پر غور کر رہی تھیں۔ پھر یہ بھی واقعہ تھا کہ مجلس قانون ساز نے ایسی ٹھوس ترقیوں کا ثبوت پیش کر دیا تھا جن کو فراموش نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دو سال

کے اندر ہی اسمبلی نے پریس کے قوانین اور دوسرے تہدیدی قوانین منسوخ کر دیئے تھے، مالی پالیسی میں تبدیلی، اور اخراجات میں ایک موثر تخفیف کرائی تھی، اور ریلوے کو قومی بنانے اور فوج کو ہندستانی بنانے کی داغ بیل ڈال دی تھی۔ ۱۹۲۳ء میں عدم تبدیلی کے حامیوں کو نیچا دکھا کے سوراج پارٹی میدان مارتی رہی۔ ۱۹۲۳-۲۴ء کے موازنہ میں گورنر جنرل کے نمک کے محصول کو اپنے اختیار خصوصی سے برقرار رکھنے والی مشہور تصدیق نے خواہ یہ اقدام کتنا ہی ضروری کیوں نہ ہوتا، لبرل پارٹی کی اکثریت کو بھڑکا دیا تھا۔ اور سوراج پارٹی کو یہ کہکر اپنے مفید مطلب پروپیگنڈا کرنے کا ایک اور نادر موقع مل گیا کہ کونسلوں کے نظام کو ارباب حکومت نے جبر و زیادتی کا ایک طاقتور آلہ کار بنا لیا ہے، لہٰذا جس طرح ہو سکے اس پر قبضہ کر لینا چاہئے۔ ۱۹۲۳ء کے موسم گرما میں عدم تبدیلی کے حامیوں نے قومی جھنڈے کی جو تحریک ناگپور سے اٹھائی وہ کچھ دن تو چلی، لیکن لوگوں کی توجہ اس طرف زیادہ دیر نہ رہنے پائی۔ نومبر ۱۹۲۳ء میں جب انتخابات کا وقت آیا تو لبرل پارٹی انتہائی کمزور تھی۔ عدم تبدیلی کے حامی بھی میدان چھوڑ رہے تھے۔ مگر سوراجی اپنی صفیں مضبوط بناتے جا رہے تھے۔ اگست کے آخر میں مسٹر محمد علی جیل سے چھوٹ گئے تھے اور ۲۵ ستمبر کو دہلی میں کانگرس کا ایک خاص جلسہ منعقد کیا گیا جس میں مسٹر محمد علی نے اعلان کیا کہ ان کو

اسمبلی کا دوسرا انتخاب

سہ گونہ بائیکاٹ میں ترمیم

مسٹر گاندھی نے یرودا جیل سے بذریعہ التماس اطلاع دی ہے کہ ان کو کونسلوں کی شرکت ممکن بنانے کے لئے سہ گونہ بائیکاٹ میں ترمیم منظور ہے۔ لیکن تعجب کی بات ہے کہ ان تمام موافق حالات کے باوجود جو ان کو حاصل تھے، انتخابات میں سوراجی امیدواروں کی زیادہ تعداد کامیاب نہ ہوسکی۔ صرف صوبہ متوسط میں ان کو دوسری تمام جماعتوں کے مقابلے میں کھلی اکثریت حاصل تھی۔ بنگال میں انفرادی طور پر دوسری ہر جماعت کے مقابلے میں یہ پارٹی زیادہ مضبوط تھی اور مرکزی اسمبلی میں کل تقریباً ۱۴۰ اراکین میں سے اس کے ممبر صرف ۴۵ تھے۔ تاہم اس حیثیت سے ان کو انتخابات میں حقیقی کامیابی ہوئی کہ اب تک ان کے جو اعتدال پسند حریف ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقہ کے سیاسی نصب العین کی نمائندگی کے اجارہ دار بنے بیٹھے تھے وہ اجارہ اب سوراج پارٹی نے چھین لیا۔ اواخر ۱۹۲۳ء میں کانگریس کے سالانہ اجلاس منعقدہ کوکونڈا میں سوراج پارٹی اور مسٹر گاندھی کے معتقدین میں پھوٹ پڑتے پڑتے رہ گئی۔ ایک تجویز یہ تھی کہ کانگریس کے دستور میں کوئی ایسی تبدیلی کی جائے کہ جس سے کانگریس کا نصب العین آزادی کامل قرار پا جائے۔ لیکن لیڈروں کی اکثریت نے اس کی مخالفت کی۔ اگرچہ سہ گونہ بائیکاٹ کی جس میں کونسلوں

اسمبلی میں کانگریس کی شرکت

کا بائیکاٹ بھی شامل تھا ایک بار پھر رسمی طور پر تائید کردی گئی تھی مگر سوراج پارٹی چند ہفتوں کے بعد کونسلوں میں جا شریک ہوئی۔ البتہ سوراج پارٹی کے اراکین کو

یہ ہدایت کردی گئی تھی کہ کسی قسم کا کوئی عہدہ نہ قبول کریں اور نہ کسی سلکٹ کمیٹی (مجلس منتخبہ) کی رکنیت کے لئے کھڑے ہوں۔ صوبہ متوسط میں سوراجی لیڈروں نے سچ مچ "تخریبی" چالیں چلیں۔ انھوں نے وزارتیں قبول کرنے سے انکار کر دیا، اور ہر سرکاری تجویز کو مسترد کرنے لگے، یہاں تک کہ گورنر کو مجبور ہونا پڑا کہ نظم و نسق چلانے کی خاطر ان ہنگامی اختیارات سے کام لے جن کی گنجائش آئین میں ایسے مواقع کے لئے رکھی گئی تھی۔ امور منتقلہ کے بارے میں گورنر کو صرف اس قدر رقم منظور کرنے کا اختیار تھا جس کے بغیر ایک مہذب طرز حکومت چل ہی نہ سکے۔ لہٰذا نتیجہ یہ ہوا کہ توسیع اور ترقی کی تمام تجاویز نیز نئے اخراجات کلیتہً ملتوی رہے۔ بنگال میں سوراجیوں نے ایک مشترکہ وزارت قائم کر لی تھی جو کچھ دنوں تک نظم و نسق چلاتی رہی، لیکن آخر کار یہاں بھی گورنر کو وزارت معطل کر دینا پڑی۔

فرقہ وارانہ فسادات سنہ ۱۹۲۳ کا کوئی تذکرہ مکمل نہیں کہلایا جا سکتا تاوقتیکہ ان فرقہ وارانہ ہنگاموں کا ذکر نہ کیا جائے۔ جن کی وجہ سے اس سال کا دامن اتنا داغدار ہے۔ مارچ اور اپریل میں امرتسر، ملتان اور پنجاب کے دوسرے علاقوں میں کھلم کھلا نہایت شدید قسم کے فسادات ہوئے۔ مئی میں پھر امرتسر میں فسادات ہوئے اور سندھ میں بھی۔ جون اور جولائی میں مرادآباد، میرٹھ اور صوبہ متحدہ کے ضلع الہ آباد میں بلوے ہوئے اور کسی قدر شدید ہنگامہ اجمیر میں بھی ہوا۔ اگست اور ستمبر میں پھر ایک بار امرتسر میں نیز پانی پت جبل پور، گونڈہ، آگرہ، اور رائے بریلی میں نہایت افسوسناک بلوے ہوئے۔

سب سے زیادہ سخت ہنگامہ محرم کے موقع پر سہارنپور میں ہوا۔ مزید برآں مسلمانوں میں تحریک شدھی کی وجہ سے بڑا اضطراب پھیل گیا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ بعض فرقوں کو ہندو مت میں واپس لے آیا جائے۔ اس سال کے آخری تین ماہ میں کانگرسیوں نے اپنی ساری توجہ فرقہ وارانہ منافرت کو دور کرانے میں صرف کی۔ جہاں کہیں فساد ہوتا، کانگرسی لوگ اپنے ذاتی اثر سے کام لے کر مفاہمت پیدا کرانے جا پہنچتے۔ لیکن دونوں مذہبوں میں صدیوں کے اختلافات اب اس نوبت پر پہنچ گئے تھے کہ انفرادی کوششیں ان کو رفع دفع نہ کر سکتی تھیں۔ کانگرس کے جلسہ دہلی میں "قومی میثاق" کا خاکہ تیار کرنے کے لئے ایک چھوٹی سی کمیٹی بنائی گئی۔ اس کے بعد مسٹر سی۔ آر داس اور ان کے چند رفیقوں نے مل کر ایک تجویز بنائی جو "میثاق بنگال" کے نام سے موسوم ہوئی۔ لیکن ہر نقطۂ خیال کے ہندوؤں نے اس کی مخالفت میں طوفان مچا دیا۔ کوکوناڈا کانفرنس میں دونوں تجویزوں پر غور کیا گیا۔ لیکن کسی قطعی فیصلہ پر پہنچنا ممکن نہ ہو سکا۔

۱۹۲۴ء۔ رنگاچاری کی تجویز

فروری ۱۹۲۴ء میں مرکزی اسمبلی میں پہلی اہم تجویز مسٹر رنگاچاری کی طرف سے پیش کی گئی جس میں گورنر جنرل باجلاس کونسل سے سفارش کی گئی تھی کہ قانون حکومت ہند پر کچھ اس طرح نظر ثانی کرنے کا اہتمام کیا جائے کہ صوبوں کو تو صوبائی خود مختاری حاصل ہو جائے اور ملک کو سلطنت برطانیہ کے اندر خود مختار نوآبادیات کا درجہ مل جائے۔ سوراج پارٹی نے

پنڈت موتی لال نہرو؛ گول میز کانفرنس کے تصور کی ابتدا

انڈیپنڈنٹ

ممبروں کے ساتھ اشتراک کر کے "نیشنلسٹ پارٹی" بنائی اور موتی لال نہرو کی پیش کردہ ترمیم منظور کر دی جس کا مقصد یہ تھا کہ ایک گول میز کانفرنس منعقد کی جائے، جو ہندوستان میں کامل ذمہ وار حکومت کے قیام کے لئے ایک اسکیم تیار کر کے پیش کرے۔ اپنی تقریر کے دوران میں انھوں نے کہا کہ ان کی پارٹی اسمبلی میں تعاون کرنے آئی ہے اور اگر حکومت اس تعاون کو قبول کرے گی تو اُسے معلوم ہوگا کہ سوراجی ممبر اس کے ساتھ ہیں ورنہ پھر سوراجی اپنے حقوق پر اڑے رہیں گے، اور عدم تعاون کرتے رہیں گے۔

گاندھی کی رہائی جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے اس موقع پر مسٹر گاندھی بتاریخ ۵ر فروری ۱۹۲۴ء کو جیل سے چھوٹے۔ تھوڑے دنوں تو وہ سیاسی پیچیدگیوں میں نہ پڑے، کیونکہ بہت کمزور تھے مگر (اور یہ وہ القاء ہے جس کا ذکر مسٹر محمد علی نے کیا تھا) تھوڑے ہی دن بعد انھوں نے ایک خط شائع کیا جس میں بتایا گیا تھا کہ وہ سہ گونہ بائیکاٹ سے متعلق اپنے ابتدائی اصول پر ہنوز قائم ہیں۔ اس خط نے سوراج پارٹی کے لیڈروں کو عجیب مخمصہ میں ڈال دیا۔ پارٹی کے لیڈروں نے مسٹر گاندھی سے ملاقات کی اور یہ درخواست کی کہ جب تک کونسلوں میں شرکت سے متعلق وہ (مسٹر گاندھی) کوئی قطعی فیصلہ نہ کریں ان کو صوبائی اور مرکزی مجالس قانون ساز کا رکن رہنے کی اجازت دیدی جائے۔ مسٹر گاندھی نے یہ دیکھکر کہ وہ ابھی پوری طرح صحتیاب نہیں ہوئے ہیں اسے منظور کر لیا۔

گاندھی اور سوراج پارٹی کی کشمکش ۱۹۲۴ء کے شروع موسم گرما میں

مسٹر گاندھی اور سوراجیوں کے درمیان بات چیت شروع ہوئی، اور جون ۱۹۲۴ء میں مسٹر گاندھی نے یہ اعلان شائع کر دیا کہ چونکہ سوراجی پارٹی کے اراکین بائیکاٹوں کو تسلیم نہیں کرتے اس لئے ان کو انڈین نیشنل کانگرس کی مجلس عاملہ کے عہدوں پر مامور نہ رہنے دیا جائے۔ اسی زمانے میں جب مئی اور جون میں اسمبلی کا خاص اجلاس ہوا تو سوراج پارٹی نے آہنی مصنوعات کی تامین کے مسودۂ قانون کی تائید کی اور اپنے قدیم اصولوں سے انحراف کا مزید ثبوت یہ دیا کہ منتخبہ اور قائمہ مجلسوں کی رکنیتیں قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ ان حالات کے تحت جب ۲۷ جون کو احمد آباد میں کانگریس کی مجلس عاملہ کا جلسہ ہوا تو سوراجیوں اور مسٹر گاندھی کے مابین معرکہ کارزار گرم ہوا اور خاصی دلچسپی رہی۔ مسٹر گاندھی نے بہت سی تحریکیں پیش کی تھیں جن میں ایک یہ تھی کہ کانگریس کمیٹی کے ہر رکن پر لازم ہوگا کہ وہ ہر مہینہ دو ہزار گز سوت کاتے ورنہ اس کی رکنیت باقی نہیں رہے گی۔ دوسری تجویز یہ تھی کہ جو لوگ بائیکاٹوں پر عمل نہ کریں وہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی سے مستعفی ہو جائیں۔ خود اس جلسہ ہی میں مسٹر گاندھی کو یہ اندازہ ہو گیا کہ اگرچہ وہ اپنی پیش کردہ تحریکیں ایک چھوٹی سی اکثریت کے ساتھ منظور کرا لے سکیں گے، لیکن ملک کی رائے عامہ ان کے خلاف ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی ترمیموں اور مفاہمتوں کی نوبت پہنچی، اور ان کی تحریکوں میں سے تعزیری دفعات خارج کر دیئے گئے۔

گاندھی کی شکست

شروع جولائی میں انھوں نے اعلان عام کر دیا کہ مجھے شکست ہوئی اور نیچا دیکھنا پڑا ہے۔ اور اب

میں چاہتا ہوں کہ کانگریس سے الگ ہو کر اپنی خدمات صرف ہندو مسلم اتحاد،
کھدر اور اچھوتوں کے لیے وقف کر دوں۔ تاہم وہ بادلِ ناخواستہ
اس پر تیار ہو گئے کہ کانگریس میں شریک رہیں، اور یہ تجویز کی کہ کانگریس ان
تینوں مذکرہ بالا امور پر اپنی توجہ مرکوز کر دے۔ سوراجی اس پر راضی
نہ ہوئے لیکن مسٹر گاندھی اپنی بات پر جمے رہے۔ انھوں نے صاف کہہ دیا
کہ ان کی تجویزوں پر عمل نہ کیا گیا تو وہ کانگریس سوراجیوں کے لئے چھوڑ دیں گے
اور خود ایک الگ ادارہ قائم کر لیں گے۔ اس دوران میں فرقہ واری ہنگامے

فرقہ واری بلوے برابر ہوتے رہے۔ جولائی ۱۹۲۴ء میں دہلی میں
ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان شدید لڑائی ہوئی۔ اسی مہینے ناگپور میں
بڑا سخت فساد ہوا۔ اگست کا مہینہ اور بھی برا نکلا۔ برطانوی ہندوستان میں
لاہور، لکھنؤ، مراد آباد، بھاگلپور اور ناگپور میں فسادات ہوئے اور ریاست نظام
میں بمقام گلبرگہ بڑا ہنگامہ ہو گیا۔ ستمبر اور اکتوبر میں شاہجہانپور، کنکنارہ
اور الہ آباد میں بلوے ہوئے۔ سب سے زیادہ مہیب ہنگامہ کوہاٹ میں
ہوا، جس کے بعد وہاں کی ساری ہندو آبادی ترکِ وطن کر کے چلی آئی۔

گاندھی کا کفارہ برت حالات کے اس پس منظر میں یکم ستمبر ۱۹۲۴ء کو
مسٹر گاندھی نے یہ اعتراف کیا کہ ان کی تحریک ہی سے جذبات میں یہ اشتعال
پیدا ہوا ہے اور اعلان کیا کہ اس ذمہ داری کا کفارہ ادا کرنے کے لئے وہ تین
ہفتے کا برت رکھیں گے۔ اس وقت مسٹر گاندھی کی ہوا ذرا اکھڑی ہوئی تھی۔
اس سلسلہ میں بہت قابل غور بات یہ ہے کہ انھوں نے جب کبھی بڑے

قسم کے برت رکھے ہیں تو کچھ اسی قسم کے حالات پائے جاتے تھے۔

دہلی کی اتحاد کانفرنس ایک ہفتہ بعد ۲۶ ستمبر ۱۹۲۴ء کو دہلی میں
مشہور اتحاد کانفرنس ہوئی کہ فرقہ وارانہ مشکلات کا حل دریافت کرے۔
اس کانفرنس میں ہندو، مسلمان، پارسی، عیسائی اور سکھ سب شریک ہوئے۔
اور کارروائیوں کے علاوہ کانفرنس نے پندرہ آدمیوں کی ایک کل ہند
پنچایت بنادی اور اس کا یہ فریضہ قرار دیا کہ جابجا ملاپ سبھائیں قائم
کرے۔ لیکن بدقسمتی سے اتحاد کانفرنس کا کوئی عملی نتیجہ برآمد نہ ہوا اور کل ہند
پنچایت کے تو کام کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ ۲۵ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو

سوراج پارٹی کی ترقی لارڈ ریڈنگ نے وہ قانون نافذ کیا جو عام طور سے
بنگال آرڈیننس کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی رو سے ان لوگوں کی فوری
اور بروقت گرفتاری اور سزا کے متعلق کارروائی کی اجازت دی گئی تھی جن کا
مقصد انقلابی جرائم کرنا ہو۔ جو لوگ اس طرح گرفتار ہوئے ان میں بنگال
کی سوراج پارٹی کے بھی چند ممبر تھے۔ ایگزیکیٹو آفیسر کلکتہ کارپوریشن بھی گرفتار ہوئے
جو اس پارٹی کے ممبر تھے۔ ان گرفتاریوں پر جو شورش ہوئی اس سے فائدہ اٹھا کر
سوراج پارٹی نے یہ غل مچانا شروع کیا کہ حکومت نے ان کو نشانہ ظلم و
زیادتی بنا رکھا ہے، اور وہ مسٹر گاندھی کے ساتھ ایک معاہدہ کرنے میں
کامیاب ہو گئے جس کی رو سے یہ ضروری قرار پایا کہ اس نئی استبدادی
پالیسی کا مقابلہ کرنے کے لئے تمام جماعتیں متحد ہو جائیں۔ اس معاہدہ میں یہ
بھی سفارش کی گئی کہ عدم تعاون کے پروگرام کو باضابطہ طور پر ملتوی

قرار دیدیا جاے ہے۔ (سوا اس کے کہ جہانتک بدیسی کپڑے سے اجتناب کا تعلق ہے)۔ اس کی رو سے سوراج پارٹی کو اجازت دیدی گئی کہ کانگرس کی جانب سے اور کانگرس کے مسلمہ جزو کی حیثیت سے وہ کونسلوں میں کام جاری رکھے۔

آل پارٹی کانفرنس غرض معاہدہ کی بدولت سوراج پارٹی والوں کو مسٹر گاندھی پر فتح حاصل ہوگئی اور اس کامیابی نے ان کی ہمت اتنی بڑھادی کہ انھوں نے تمام پارٹیوں کے لیڈروں کی ایک کانفرنس منعقد کی۔ ۲۱ نومبر کو بمبئی میں اس کا جلسہ ہوا۔ اور لبرل انڈیپنڈنٹ اور مسز بیسنٹ کی نیشنل ہوم رول لیگ کے حامی اس میں شریک ہوئے لیکن کسی ٹھوس تصفیہ پر پہنچنا ممکن نہ ہوسکا۔ ایک کمیٹی بنائی گئی جس کے جلسے جنوری اور فروری سنہ ۱۹۲۵ء میں ہوتے۔ اور پھر اس کی دو ذیلی کمیٹیاں بن گئیں تاکہ ایک تو ہندو مسلم اختلافات کا حل تلاش کرے، اور دوسری آئینی ترقی کے لیے اسکیم مرتب کرے۔ پہلی کمیٹی مفاہمت کو غیر ممکن پاکر منتشر ہوگئی۔ دوسری کمیٹی نے صرف یہ کیا کہ مسز بیسنٹ نے جو مسودہ قانون بعنوان "بل دربارہ دولت مشترکہ ہندوستان" (Commonwealth of India Bill) مرتب کیا تھا اس میں چند ترمیمیں پیش کردیں۔ سنہ ۱۹۲۴ء کے آخر زمانے میں کانگرس کا جلسہ بلگام میں۔ مسلم لیگ کا بمبئی میں اور نیشنل لبرل فیڈریشن کا لکھنؤ میں ہوا۔ کانگریس نے اس معاہدہ کی باضابطہ توثیق کردی جو مسٹر گاندھی اور سوراجیوں کے مابین ہوا تھا۔ مسلم لیگ نے قطعی فیصلہ کرلیا کہ وہ کانگرس میں

اپنے آپ کو ہرگز ضم نہ کرے گی۔ لبرل لیگ نے ڈاکٹر چیٹر جی کی صدارت میں تحریک عدم تعاون کی مذمت کی اور نوآبادیاتی طرز کی ذمہ وار حکومت کے حصول کے لیے ایک پروگرام کا خاکہ مرتب کیا۔ شروع ۱۹۲۵ء میں سوراجیوں نے بنگال میں وہ بل نامنظور کر دیا جس کی ضرورت اس لیے

۱۹۲۵ء۔ جوابی تعاون کی تمہید

پیش آئی تھی کہ بنگال آرڈیننس کی میعاد ختم ہونے کو تھی۔ بالآخر گورنر نے اپنے اختیارات سے اس بل کی منظوری دی۔ اس زمانے میں سارے ملک میں ہر طرح کی سیاسی کشمکش سے تھکن اور بیزاری سی محسوس کی جا رہی تھی۔ اور خود سوراجی پارٹی کے بعض رکن شبہات کا اظہار کرنے لگے تھے۔ صرف دو صوبے ایسے تھے جہاں یہ لوگ دوعملی نظام حکومت کو ختم کر پائے تھے، ورنہ دوسری قانون ساز مجلسوں میں تو سوراج پارٹی کی کامیابیاں لبرلوں کی برائے نام اور ناقابلِ تعریف کامیابیوں سے کچھ زیادہ نہ تھیں چنانچہ یہ تجویز شروع ہوئی کہ پارٹی کو چاہئے کہ عہدے قبول کرے۔ اور "اندر سے تخریب کا عمل شروع کرے"۔ مرکزی اسمبلی میں سوراجیوں اور انڈیپنڈنٹ ممبروں کا اشتراک جس کا اوپر ذکر ہوا ختم ہو چکا تھا۔ مسٹر جناح اب ایک علیحدہ انڈیپنڈنٹ پارٹی کے لیڈر تھے، اور ایوان کے اندر عام رجحان یہ ہونے لگا تھا کہ رائیں مختلف معاملات کا حسن و قبح دیکھکر دی جائیں نہ کہ خواہ مخواہ حکومت کی پیش کردہ ہر تحریک کی اندھا دھند مخالفت کر دی جائے۔ مباحثوں کا لہجہ اور رنگ بہت

قابل تعریف ہو چلا تھا۔ اور اگرچہ بعض وقت فریقین کی طرف سے گرماگرم تقریریں ہوتیں مگر پھر بھی تلخ تقریریں بہت کم ہو گئی تھیں اور پیچیدہ اور خاروار مسائل کی بحث بھی خوشگوار دلی کی فضا میں ہوتی تھی۔ اسمبلی کے دہلی والے اجلاس ۱۹۲۵ء کے دوران میں اصلاحات کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ جو "مڈی مین رپورٹ" کے نام سے بھی مشہور ہے، شائع ہوئی اور ساتھ ہی اس اعلان نے بڑی دلچسپی پیدا کر دی کہ لارڈ ریڈنگ کو لارڈ برکن ہیڈلے" جو اس وقت وزیر ہند تھے، ملاقات و گفت و شنید کے لئے انگلستان بلایا ہے۔ اس وقت اور بھی کئی آئینی خاکے منظر عام پر تھے۔ ایک مسز بیسنٹ کا مسودہ تھا جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ یہ مسودہ اوائل ۱۹۲۵ء میں شائع ہو گیا تھا۔ پھر شروع اپریل میں بمقام کانپور سر تیج بہادر سپرو کی صدارت میں ایک بڑے جلسہ عام نے اسے منظور بھی کر لیا تھا

عہدے قبول کیے گئے

۱۹۲۵ء کا سال فرقہ واری کشمکش کے پس منظر پر آئینی ترقیوں کا سال تھا۔ اسی سال جوابی تعاون کا اصول رونما ہوا۔ سوراج پارٹی کے ایک سے زیادہ ممتاز ممبروں نے عہدے قبول کئے، اور بہت سے ممتاز ممبر اس پارٹی سے الگ بھی ہو گئے۔ اگست کے مہینے میں ڈاکٹر سہروردی نے جن کو بنگال کونسل کی صدارت کے انتخاب میں بہت ہی کم فرق سے شکست ہوئی تھی، سوراج پارٹی سے استعفیٰ دیدیا کیونکہ انھوں نے گورنر بنگال سے ملاقات کی تھی اور مسٹر گاندھی نے اس کو بہت برا

مانا تھا۔ اسی مہینے مسٹر وی۔جے پٹیل مرکزی اسمبلی کے صدر منتخب ہوئے،
اور سرکاری ممبروں سے یہ اپیل کرتے ہوئے کہ وہ ان کے فرائض کی
بجا آوری میں ان کے ساتھ تعاون کریں، انھوں نے ان سے تعاون
کرنے کی آمادگی کا اظہار کیا۔ اوائل اکتوبر میں صوبہ متوسط کی

سوراج پارٹی سے علیحدگیاں

سوراج پارٹی کے لیڈر مسٹر ایس۔
بی۔ تمبے نے اس صوبے کی حکومت میں ایگزیکیٹو کونسل کی ممبری قبول
کرلی۔ سوراج پارٹی سے جن لوگوں نے استعفے دیدیئے ان میں سے
اہم لوگ یہ تھے — پنڈت مدن موہن مالویہ، مسٹر ایم۔ آر۔ جیکار،
ڈاکٹر مونجے، اور ان۔ سی کیلکر۔ یہاں ہم واقعات کی رفتار سے ذرا
آگے بڑھ آئے ہیں۔ یکم مئی ۱۹۲۵ء کو مسٹر گاندھی نے کلکتے میں
ایک بہت اہم تقریر کے دوران میں اس خط وکتابت کے متعلق اپنی
قطعی لاعلمی کا اظہار کیا جو کہا جاتا تھا کہ اس وقت لارڈ برکن ہیڈ مسٹر
سی۔ آر داس کے درمیان ہو رہی تھی۔ انھوں نے کہا کہ وہ اس کو زیادہ
ترجیح دیتے ہیں کہ ہندستان میں اندرونی طور پر قوت پیدا کرنے کا
تعمیری پروگرام بنایا جائے۔ اس پروگرام کی تین مدیں حسب ذیل تھیں:۔

(۱) ہندو مسلم اتحاد

(۲) چھوت چھات کا خاتمہ

(۳) چرخہ کا استعمال

گاندھی اور تعمیری پروگرام

ان میں سے پہلی مد کے بارے میں

انھوں نے کہا :-

"کیا ہم ہندو مسلم اتحاد حاصل کر ہی نہیں سکتے ! میں اس بارے میں اپنی نا اہلیت تسلیم کر چکا ہوں ...... مجھے اس کے کوئی آثار نہیں معلوم ہوتے کہ ہندو یا مسلمان، دونوں میں سے کوئی بھی میرے پیش کردہ علاج کو قبول کرنے پر تیار ہوں گے۔ لہذا آجکل میں صرف اس سوال کا برائے نام تذکرہ کر دینے پر اکتفا کرتا ہوں، اور صرف اتنا کہنے پر قناعت کرتا ہوں کہ اگر ہم اپنے ملک کو نجات دلانا چاہتے ہیں تو ایک نہ ایک دن ہم ہندو مسلمانوں کو ملنا پڑے گا، اور اگر ہماری قسمت میں یہی لکھا ہے کہ ملنے سے قبل ایک دوسرے کا خون ضرور بہائیں، تو میرے نزدیک تو یہ جس قدر جلد کر لیا جائے ہمارے لئے بہتر ہوگا۔ اگر ہمیں ایک دوسرے کے سر توڑنا ہی ہیں تو یہ بھی مردانہ وار ہونا چاہیے"۔

چھوت چھات کے متعلق انھوں نے کہا :-

"جب تک ہندو مت کے دامن پر چھوت چھات کا داغ باقی ہے اس وقت تک میں سوراج کے حصول کو قطعی ناممکن سمجھتا ہوں اگر بالفرض سوراج کا تحفہ ڈاؤننگ اسٹریٹ سے ہندوستان کو عطا بھی کر دیا جائے تو بھی جب تک اس ملک میں چھوت چھات کی لعنت باقی ہے یہ تحفہ بھی اس ملک کے حق میں لعنت ہوگا"

اس تقریر کے برعکس ایک تقریر چند ہی دنوں بعد مسٹر سی۔ آر داس نے

سی آر داس سلطنت کے تصور کی حمایت میں

نریدپور میں کی۔ انھوں نے یہ سوال پیش کیا کہ آیا ہندوستان کے سامنے یہ نصب العین ہونا چاہئے کہ سلطنت برطانیہ میں شامل رہتے ہوئے آزادی حاصل کرے یا یہ کہ سلطنتِ برطانیہ سے الگ ہو کر۔ پھر اوّل الذکر نصب العین کی تائید کرتے ہوئے انھوں نے کہا:۔

"سلطنت میں شامل رہنے کا تصوّر ہمارے سامنے بہت سے فائدوں کی واضح امید پیش کرتا ہے۔ آجکل نوآبادیاتی مرتبہ ہرگز غلامی کا ہم معنے نہیں ہے۔ یہ دراصل ایک ایسا اتحاد ہے جس میں سلطنت کے تمام اجزاء چند اہم فائدوں کے پیش نظر، تعاون کے صحیح جذبے کے ساتھ، اور اپنی مرضی سے شریک ہوتے ہیں۔ اور ایسے آزادانہ اتحاد میں ظاہر ہے کہ علیحدہ ہو جانے کا بھی ویسا ہی اختیار رہتا ہے۔ جنگ سے قبل سلطنت کے بعض حصّوں میں علیحدگی کا رجحان زور پکڑ رہا تھا، لیکن جنگ کے بعد تو عام یقین یہی ہے کہ سلطنت یا اس کے اجزاء ترکیبی صرف ایک عہدیہ (Confederation) ہی کی صورت میں اپنا وجود برقرار رکھ سکتے ہیں۔ یہ اچھی طرح محسوس کیا جا چکا ہے کہ موجودہ حالات میں کوئی قوم الگ تھلگ رہ کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اور نوآبادیاتی مرتبہ کی بدولت جہاں

ایک طرف اس عظیم الشان دولت مشترکہ موسوم بہ "سلطنت برطانیہ" کے ہر جزو ترکیبی کو کامل حفاظت نصیب ہوتی ہے، وہیں دوسری طرف ہر جزوِ ترکیبی کو یہ حق بھی ملتا ہے کہ وہ اپنے منشاء زندگی کو پورا کرے، ترقیاں کرے، اور اپنے عزائم کی تکمیل کرے۔
اس طرح اس نوآبادیاتی مرتبہ میں سوراج کی وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جن کا میں نے ذکر کیا ہے۔ میرے لئے یہ تصور اعلیٰ زیادہ دلکش ہے کہ اس کی ایک روحانی اہمیت بھی ہے: وہ اس طرح کہ میں عالمگیر امن کا خواہاں اور معتقد ہوں، یعنی ساری دنیا کو ایک وفاق میں منسلک دیکھنا چاہتا ہوں اور میرے نزدیک یہ عظیم الشان دولت مشترکہ اقوام جسے سلطنتِ برطانیہ کہتے ہیں ایک وفاق ہے ایسی مختلف نسلوں کا جو اپنا اپنا الگ ذہنی نقطہ نظر رکھتی ہیں۔ اب اگر اس کی باگ ڈور ایسے مدبروں کے ہاتھ میں ہو جو اس کی مناسب طور پر رہبری کریں تو یہ اس زیر دست مسئلے کو حل کرنے میں ایک بڑا اقدام ہوگا جو مدبرین کے سامنے درپیش ہے: یعنی ساری دنیا کو ایک ایسے بڑے وفاق میں منسلک کر دینے کا مسئلہ جس کا انسانی دماغ تصور کر سکے، یعنی نوعِ انسانی کا وفاق! ...... میرے نزدیک اس میں ہندستان کی بھی بھلائی ہے اور ساری دنیا کی بھی بھلائی ہے کہ ہندستان اس دولت مشترکہ اقوام میں شامل رہتے ہوئے

ہی آزادی کی کوشش کرے، اور اس طرح سارے بنی نوع انسان کے مفاد کو فائدہ پہنچائے "۔

سلطنت کی مذمت میں جو بیانات آجکل ہمارے کانوں میں پڑتے رہتے ہیں ان کے مقابلہ میں ہندوستان کے ایک جلیل القدر قوم پرست کی زبان سے نکلے ہوئے یہ الفاظ کتنے عجیب معلوم ہوتے ہیں!

سی آر داس کی وفات اس کے چند ہی ہفتوں بعد ۱۶ر جون ۱۹۲۵ء کو مسٹر سی، آر۔ داس نے وفات پائی اور ان کی موت کئی حیثیتوں سے ایک زبردست قومی سانحہ تھی۔

آئینی اصلاحات پر لارڈ برکن ہیڈ کا اعلان ۷ر جولائی ۱۹۲۵ء کو لارڈ برکن ہیڈ نے دارالامراء میں وہ اعلان کیا جس کا بہت دنوں سے انتظار تھا۔ انھوں نے بیان کیا کہ لارڈ ریڈنگ سے ان کی گفت وشنید کا کوئی قطعی فیصلہ کن نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ قبل اس کے کہ کوئی آئینی تبدیلیاں کی جائیں مرکزی اسمبلی سے مشورہ لینا ضروری ہوگا لیکن نظر ثانی کی جو میعاد ازروئے قانون مقرر کی گئی ہے اس کے ختم ہونے سے قبل اصلاحات پر نظر ثانی کرنا منحصر ہے چند حالات کے واقع ہونے پر۔ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ اصلاحات نہ تو کلیۃً کامیاب ثابت ہوئے ہیں اور نہ بالکل ناکام رہے ہیں۔ حالانکہ ہندستانی لیڈروں نے ان کی مذمت کرنے اور ان کو بدنام کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی اور ہندستان کی سب سے زیادہ منظم جماعت بالقصد ان کو

درہم برہم کرنے پر تلی رہی۔ دس سال بعد اس آئین پر نظر ثانی کی ضرورت یقیناً ہوگی، اور ہر چیز کی نئے سرے سے تشکیل کرنا ہوگی۔ ساتھ ہی حکومت مڈیمین کمیٹی کی اقلیت کی رپورٹ کو تسلیم نہیں کریگی ہے جس میں یہ سفارش کی گئی تھی کہ فوراً ایک گول میز کانفرنس طلب کی جائے۔ جہاں تک اکثریت کی رپورٹ کا تعلق ہے حکومت ہند اور مرکزی اسمبلی کی رائے معلوم ہونے کے بعد، حتی الامکان اس کے بارے میں کارروائی کی جائے گی۔ اس تقریر کی ہندستان میں ویسی آؤبھگت نہیں ہوئی جیسی کہ امید کی جاسکتی تھی۔ جو دیر لگائی جارہی تھی اس پر بڑی بے صبری کا اظہار کیا گیا، لیکن بہت کم لوگوں نے یہ سوچنے کی زحمت گوارا کی کہ اس دیر کی ذمہ واری ہندستان کی کس جماعت کے سر عاید ہوتی ہے؟ جولائی ۱۹۲۵ء میں کرنل ڈیوڈ نے جو ہندوستانی قومیت کے بڑے حامی تھے، انگریزی لیبر پارٹی کے اخبار میں یہ نکتہ کسی قدر صاف گوئی کے ساتھ یوں پیش کر دیا:۔

"ہم ان لوگوں کی کوئی مدد کیسے کر سکتے ہیں جو خود کوئی قطعی تجویز پیش نہیں کر سکتے، اس لئے کہ وہ کسی تجویز پر متفق ہی نہیں ہو پاتے؟ چونکہ مسٹر ستیا مورتی نے مجھ پر حملہ کیا ہے، لہٰذا مجھے بھی ان سے کہنا پڑتا ہے کہ میں بادلِ ناخواستہ اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ وہ اور ان کی پارٹی جمہوریت سے ڈرتے ہیں۔ نیز یہ کہ وہ حقِ رائے دہندگی میں توسیع کے خلاف ہیں۔ وہ اچھوت کارکنوں کے خلاف ہیں۔ فاقہ زدہ کسانوں کے خلاف ہیں، اور ہندستان کے

عوام کو اختیار اور ذمہ داری سونپنے کے خلاف ہیں۔ وہ اس لئے ڈرتے ہیں کہ ان کو سارا روپیہ زمینداروں اور سرمایہ داروں سے ملتا ہے۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ وہ خود ہندوستان پر حکمرانی کریں۔ وہ نہیں چاہتے کہ ہندستان کے عوام خود اپنے اوپر حکومت کریں۔ اگر ایسا نہیں ہے تو اس ابلہانہ عدم تعاون کو چھوڑ کر آئیں اور بتائیں کہ اصلی آزادی کو برقرار اور محفوظ رکھنے کیلئے درحقیقت ان کو کس چیز کی ضرورت ہے۔"

کانگریس کا مخالفانہ ردّ عمل

جولائی ختم ہونے سے پیشتر ہی کلکتہ میں سوراج پارٹی اور کانگریس کی مجلس عاملہ کے جلسے ہوئے۔ مسٹر گاندھی، مسٹر جیکار اور مسٹر پٹیل سب شریک تھے۔ طویل مباحثہ کے بعد متعلقہ قرارداد میں یہ ظاہر کیا گیا کہ یہ مجلس حکومت سے باعزت تعاون کی پیشکش اور اس کے جو شرائط مسٹر سی آر داس نے فرید پور والی تقریر میں ظاہر کئے ان کی توثیق کرتی ہے۔ لیکن اس بات پر اظہار افسوس کرتی ہے کہ وزیر ہند کے اعلان نے باعزت تعاون کو اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور بنا دیا ہے۔ لہٰذا سوراج پارٹی کی پالسی پر کسی نظرثانی کی ضرورت نہیں۔ البتہ اگر اس قطعی اعلان میں جو حکومت ہند آئندہ کرنے والی ہے ملک کے موجودہ حالات و مطالبات کی تشفی کی صلاحیت پائی گئی تو سوراج پارٹی اس معاملہ پر دوبارہ غور کرے گی۔ اس تجویز کو بغور پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے کسی طرح بھی سوراجی پارٹی کی پرانی پالسی کی علانیہ توثیق نہیں ہوتی۔ اس کا

ایک فوری اور نہایت اہم نتیجہ یہ ہوا کہ مسٹر گاندھی نے کانگرس کا

سوراج پارٹی کا قبضہ کانگریس کے نظام پر

سارا نظام مسٹر موتی لال نہرو کے ہاتھ میں دیدیا جو سوراج پارٹی کے لیڈر تھے۔ اور یہ اعلان کردیا کہ اب اس کی ضرورت نہیں ہے کہ کانگرس زیادہ تر چرخہ کاتنے کی انجمن بنی رہی۔ جب اسمبلی کا اجلاس اگست ۱۹۲۵ء میں شملہ میں

مڈیمین رپورٹ پر مباحثہ

شروع ہوا تو خاص مسئلہ زیر بحث مڈیمین کمیٹی کی رپورٹ تھی۔ سر الگزنڈر مڈیمین خود بھی شریک تھے۔ انھوں نے بحیثیت ہوم ممبر یہ تحریک کی کہ اکثریت کی رپورٹ کے اصول تسلیم کرلئے جائیں۔ پنڈت موتی لال نہرو نے ایک ترمیم پیش کی جس میں سفارش کی گئی تھی کہ حکومت برطانیہ سے فوری طور پر تحریک کی جانے کہ وہ پارلیمنٹ میں ایک اعلان کرے جس میں ہندستان کے آئینی نظام اور نظم ونسق میں ایسی اساسی تبدیلیاں کی جائیں جو ملک کی حکومت کو پورا پورا ذمہ وار بنادیں۔ اس ترمیم میں جلد سے جلد ایک گول میز کانفرنس منعقد کرنے کی سفارش کی گئی تھی۔ دو روز کے مباحثے کے بعد یہ ترمیم حکومت کے خلاف ۷۲ اور ۴۵ رایوں کی نسبت سے منظور ہوگئی۔

سوراج پارٹی میں اختلافات

مجلس مقننہ کے باہر یہ ہوا کہ سوراج پارٹی سے ان علیحدگیوں کے باعث جن کا اوپر ذکر ہوچکا ہے شملہ کے اجلاس کے بعد ناگپور میں پارٹی کی مجلس عاملہ کا ایک جلسہ یکم نومبر کو ہوا۔ پنڈت موتی لال نہرو نے صدارت کی اور اس کی کوشش کی کہ پارٹی سے جو بغاوت

ہوئی تھی اسکی کچھ نہ کچھ توجیہہ کر دیں۔ لیکن فضا بالکل ان کے خلاف تھی۔ بار بار سوراج پارٹی کی مجلس عاملہ ۲۶ اکتوبر کو یہ طے کر چکی تھی کہ اس کی رائے میں اب وقت آگیا ہے کہ سوراج پارٹی جوابی تعاون کی پالیسی اختیار کر لے۔ ناگپور سے پنڈت موتی لال نہرو کو اس بغاوت کو فرو کرنے کے لئے فوراً بمبئی روانہ ہونا پڑا جو مسٹر جیکار اور مسٹر کیلکر کی سرکردگی میں ہو رہی تھی۔ غرض یہ فضا تھی کہ ۲۴ دسمبر ۱۹۲۵ء کو کانگریس کا سالانہ جلسہ کانپور میں مسز سروجنی نائیڈو کی صدارت میں شروع ہوا۔ ان کی صدارتی تقریر سے پنڈت موتی لال اور ان کے خاص مخالفین کے درمیان مفاہمت کی کوئی صورت نہ نکلی، اور اصلی تحریک پیش کرنے کا کام خود پنڈت جی ہی کے سر رہا۔ تحریک یہ تھی کہ اگر حکومت کی طرف سے آئینی اصلاحات کی اس مشہور تجویز کا، جو فروری ۱۹۲۴ء میں مسٹر رنگاچاری کی تحریک پر اسمبلی میں منظور ہوئی تھی، کوئی خاطر خواہ جواب نہ ملا تو سوراجی اراکین اسمبلی کی نشستیں چھوڑ دیں گے اور اجلاسوں میں شریک نہ ہونگے سوا اس حد تک کے جو ان کی نشستوں کو خالی قرار دیئے جانے سے روکنے کے لیے ضروری ہو۔ تجویز بہرحال منظور ہو گئی۔ مسٹر گاندھی نے مباحثے میں شرکت سے قطعی اجتناب کیا اور اس طرح گویا انھوں نے یہ دکھایا کہ وہ سیاسیات میں عملی حصہ لینے سے اپنے آپ کو بالکل الگ کر چکے ہیں۔ ۳۱ دسمبر کو ہندوستان کے ممتاز سیاست دانوں کا ایک جلسہ کلکتہ میں اس غرض سے ہوا کہ جوابی تعاون کی مزید حمایت کی جائے۔

۱۹۲۶ء: موتی لال نہرو اور سوراج پارٹی کا واک آوٹ

۱۹۲۶ء میں

بہت کم سیاسی یا فرقہ واری واقعات پیش آئے۔ البتہ اس تبصرہ کے اغراض کے لئے صرف یہی بتا دینا کافی ہوگا کہ ۲۷-۱۹۲۶ء کی طول طویل سالانہ رپورٹ جو حکومت ہند نے پارلیمنٹ میں پیش کرنے کے لئے مرتب کی تھی وہ مسٹر گاندھی کے ذکر سے یکسر خالی ہے!

۲۰ر جنوری ۱۹۲۶ء کو دہلی میں مرکزی اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا، اور ۱۸ر مارچ کو پنڈت موتی لال نہرو نے اپنی وہ آخری تقریر کی جس کے ختم پر وہ اپنے ساتھیوں سمیت اسمبلی سے اٹھ کر چلے آئے۔ صدر اسمبلی نے اعلان کیا کہ چونکہ سب سے بڑی جماعت ایوان سے چلی گئی ہے لہٰذا اسمبلی کی نمائندہ حیثیت باقی نہیں رہی۔ انھوں نے حکومت کو متنبہ کیا کہ اگر کوئی نزاعی یا اختلافی قانون اسمبلی میں لایا گیا تو وہ اسمبلی کا اجلاس بلا تعین میعاد ملتوی کر دیں گے۔ دوسرے دن اس اعلان پر نظر ثانی کی گئی اور ایوان کا معمولی کام چلتا رہا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ۸ر مارچ کا واک آوٹ بالکل بے اثر رہا۔ اس کی وجہ سے مزید اراکین پارٹی سے علیحدہ ہو گئے۔ اور ۳ر اپریل کو بمقام بمبئی ایک کانفرنس اس امید پر منعقد کی گئی کہ ایک نئی نیشنل پارٹی بنائی جائے، جس میں اعتدال پسند، انڈیپنڈنٹ

نیشنل پارٹی کی ابتدا

اور جو ابی تعاون کے حامی سب شریک ہوں۔ بہت سے لیڈر شریک ہوئے اور دو دن کے بحث مباحثے کے بعد انڈین نیشنل پارٹی اس مقصد سے قائم ہوئی کہ ہندستان میں سوراج یا اس طرز کی مکمل ذمہ دار حکومت جلد سے جلد رائج کرنے کی تیاریاں کرے جیسی کہ برطانوی سلطنت کی خود مختار نو آبادیوں میں ہے

اور اس میں اقلیتوں اور پست اقوام کے حقوق و مفاد کی حفاظت کا مناسب اہتمام کیا جائے۔ نئی پارٹی نے آئندہ سال کے انتخابات میں حصہ لینے کی بھی ٹھان لی جو ۱۹۲۶ء کے آخر میں ہونے والے تھے۔ اس پارٹی کی تشکیل

میثاق سابرمتی

دراصل سوراجیوں کے لئے ایک طرح کا چیلنج تھا۔ چنانچہ سوراج پارٹی کا ایک جلسہ سابرمتی میں ۲۱ ر اپریل کو منعقد کیا گیا، جس میں مسٹر گاندھی خود بھی شریک ہوئے۔ جو اختلافات پیدا ہو گئے تھے ان کو رفع کرنے کی کوششیں کی گئیں، اور وہ معاہدہ ہوا جو بعد کو "میثاق سابرمتی" کے نام سے مشہور ہوا۔ لیکن اس میثاق کی توضیح و تفسیر مختلف لوگوں نے مختلف اور متضاد پیرایے میں کرنا شروع کر دی، اور آپس میں جو طعن تشنیع بعد میں شروع ہوئی اس نے صاف بتا دیا کہ سوراجیوں اور جوابی تعاون

سوراجیوں اور جوابی تعاون کے حامیوں کی کش مکش

کے حامیوں کے مابین جو کشیدگی واقع ہوگئی تھی وہ اب ہمیشہ سے بھی زیادہ نمایاں ہوگئی ہے۔ کانگرس کا دروازہ بجائے اس کے کہ لبرلوں کے لئے کھولا جاتا، کٹر سوراجیوں کے سوا اور سب کے لئے بند کر دیا گیا۔ تاہم معاملہ (حسب معمول) کانگرس کے آئندہ اجلاس دسمبر ۱۹۲۶ء کے لئے اٹھا رکھا گیا۔

لارڈ اروِن کی آمد اور فرقہ وارانہ اتحاد کے لئے اپیل

لارڈ ریڈنگ ہندوستان سے گئے اور ان کی جگہ لارڈ اروِن اپریل ۱۹۲۶ء میں ہندوستان آئے۔ ان کی پہلی پبلک تقریر جو ۱۷ ر جولائی کو چیمسفورڈ کلب شملہ میں

ہوئی، فرقہ وارانہ اتحاد کے لئے ایک مؤثر اپیل تھی۔ لیکن اس کے باوجود ان دور طویل ہنگاموں کو شامل کر کے جو کلکتہ میں اپریل اور مئی ۱۹۲۶ء میں جاری رہے سارے ہندوستان میں پہلی اپریل ۱۹۲۶ء کو ختم ہونے والے بارہ مہینوں میں کم سے کم چالیس بلوے ہوئے جن میں ۱۹۷ جانیں ضائع ہوئیں اور ۱۵۹۸ اشخاص کم و بیش شدید طور پر زخمی ہوئے۔ پھر ۲۳ دسمبر کو ایک مذہبی جوش سے بے خود مسلمان کے ہاتھوں سوامی شردھانند کے قتل کا ہنگامہ آرا واقعہ پیش آیا۔ ختم سال پر چند ذی اثر مسلمانوں کی ایک جماعت نے بڑی کوشش کی کہ دسمبر ۱۹۱۶ء والے "میثاق لکھنو" پر نظر ثانی ہو جائے جس کی رو سے انتخاب میں رائے دہندگان کے رائج الوقت فرقہ وارانہ حلقے بنائے گئے تھے۔ لیکن یہ کوششیں کامیاب نہ ہو سکیں۔ سیاسیات کے میدان میں یاد رکھنے کے قابل بات یہ ہے کہ دیہی سوراج پارٹی جس نے دہلی میں اسمبلی کے اجلاس سے واک آؤٹ کر دیا تھا، شملہ کے ۱۹۲۶ء کے گرمائی اجلاس میں تھوڑے دنوں کے لیے واپس آ گئی۔

مجموعی حیثیت سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۹۱۹ء کے قانون کی رو سے جو مجالس قانون ساز قائم ہوئیں وہ اور خصوصاً مرکزی اسمبلی اس دوران میں ان تمام سیاسی اور نیم سیاسی اداروں پر چھا گئی تھیں جو پہلے عوام کی توجہ اور قدر دانی حاصل کرنے میں ان کے حریف تھے۔ سال کے ختم پر جو عام

۱۹۲۷ء اسمبلی کے تیسرے انتخابات

انتخابات ہوئے انھوں نے کانگرس کے اجلاس منعقدہ گوہاٹی (دسمبر ۱۹۲۶ء) کو

بالکل ماند کر دیا۔ خود انتخابات میں بھی سوراج پارٹی کی کامیابی کچھ پھیکی ہی
رہی۔ صرف مدراس میں غیر برہمن جماعت کی جو پچھلے انتخابات میں
وہاں چھائی تھی کچھ نشستیں سوراج پارٹی کو ملیں۔ الغرض جب نئی یا تیسری

سوراجیے

اسمبلی کا اجلاس ۲۴ جنوری ۱۹۲۷ء کو دہلی میں شروع ہوا
تو کل ۱۰۴ منتخب ممبروں میں سے سوراج پارٹی کے جو اس وقت اپنے آپکو
کانگرس پارٹی کہنے لگی تھی، ممبر صرف چالیس تھے۔ اس وقت اسمبلی میں سوراجیوں
اور غیر سرکاری یورپین جماعت کے سوا اور کوئی جماعت موجود ہی نہ تھی
مگر تھوڑے ہی دنوں بعد

نیشنلسٹوں کی جماعت

تمام ہندو منتخب ممبروں نے جو سوراج پارٹی
سے باہر تھے مل کر پنڈت مدن موہن مالویہ
مسٹر جیکار اور لالہ لاجپت رائے کی قیادت میں ایک "نیشنلسٹ پارٹی"
بنالی۔ پرانی انڈیپنڈنٹ پارٹی جس نے مسٹر جناح کی قیادت میں پچھلی اسمبلی
کے زمانہ میں اتنی اہم حیثیت حاصل کرلی تھی، اس وقت عملاً کالعدم تھی۔
اسمبلی کی ہیئت ترکیبی اور جماعت بندی دونوں میں بالکل کھلے طور پر
ان دو زبردست قوتوں کے مظاہر پائے جاتے تھے، جو اس وقت ہندستانی
سیاست پر اثر انداز تھیں یعنی ایک تو آئینی طریقہ کار اختیار کرنے کی تحریکیں،
اور دوسرے فرقہ داری عناد جو ہر قسم کے سیاسی اختلاف پر چھایا ہوا تھا۔

اجلاس دہلی کے دوران میں سر الگزنڈر مڈیمن، ہوم ممبر نے
ایک موقع پر ان اعتراضات کا ذکر کیا تھا جو ان خصوصی
اختیارات پر کئے گئے جو دستور کے ماتحت دیئے گئے تھے

خصوصی اختیارات کا استعمال اس تقریر کے بعض حصوں کا ہمارے موضوع سے قریبی تعلق ہے اور وہ اس قابل ہیں کہ یہاں نقل کیے جائیں۔ انھوں نے کہا :-

" یہ خیال کہ عاملہ کو مقننہ کی مرضی بجالانا چاہیئے، صرف اسی صورت میں درست ہوسکتا ہے جہاں دستور ایسا ہو کہ عاملہ اور مقننہ میں ہم آہنگی موجود ہو۔ عام پارلیمانی اداروں میں بے شک ان دونوں میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ جس کی وجہ یوں سمجھئے کہ ان دستوروں کے تحت ' اگر آپ مجھکو اور میرے دوست کو نکال باہر کریں، تو ہماری جگہ آپ کو لینا ہوگی، کیونکہ بادشاہ کی حکومت بہرحال چلانا ہے۔ ان تنقیدوں کا حقیقی جواب جو موجودہ دستور پر کی گئیں۔ اور بجا طور پر کی گئی ہیں۔ یعنی وہ تنقیدیں جو ماتحتی اختیارات سے متعلق ہیں، یہ ہے کہ ماتحتی اختیارات کا وجود اس لیئے ضروری ہے کہ کوئی ایسا اقتدار بہرحال ہونا چاہیئے جو عاملہ اور مقننہ کو ایک دوسرے سے مطابق کر سکے۔ جہاں مقننہ اور عاملہ میں مستقل کشمکش ہو وہاں کوئی دستور کام نہیں دے سکتا۔ اور نہ ایسی صورت میں کسی ملک کا انتظام چلایا جا سکتا ہے۔ ایسی حالت میں اس ڈھانچہ کے کسی نہ کسی حصہ کا ٹوٹنا ناگزیر ہے۔" آگے چل کر انھوں نے کہا

"ایک ایسی حکومت کو جیسی کہ ہماری ہے، آپ ان مابقی اختیارات کے استعمال پر جتنا زیادہ مجبور کریں گے اتنا ہی زیادہ آپ اپنے کو بھی کمزور کرینگے اور ہم کو بھی۔ حکومت پر اپنا قابو باقی رکھنے کی فکر میں آپ رفتہ رفتہ اس چیز کو روزمرہ کا معمول سمجھنے لگیں گے۔" اپنی تقریر کے خاتمہ پر انھوں نے یہ مدبرانہ رائے ظاہر کی:۔

"دوسرے دستوروں میں ترقی کا راستہ یہی ہوتا ہے کہ مابقی اختیارات کو عدم استعمال کے ذریعہ معطل کر دیا جائے، نہ یہ کہ مسلسل استعمال کرا کے ان کو تحریک اور تقویت پہنچائی جائے۔"

سائمن کمیشن کا تقرر

۱۹۲۷ء کا خاص واقعہ یہ ہے کہ سر جان سائمن کی صدارت میں ایک "دستوری کمیشن" مقرر کیا گیا اور اس کا اعلان برطانوی پارلیمنٹ میں اور ویسرائے کے یہاں سے ایک ساتھ ۸ نومبر ۱۹۲۷ء کو کیا گیا۔ یہ کمیشن ہی ہمارے اس تبصرہ کے تیسرے دور کا نقطۂ آغاز ہوگا۔ پچھلے بارہ مہینوں کی طرح اس سال بھی مسٹر گاندھی سیاسیات سے کنارہ کش رہے۔ موسم گرما میں پھر چند کوششیں ہوئیں کہ "میثاق لکھنؤ" پر جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے نظر ثانی کے سوال کو دوبارہ اٹھایا جائے تاکہ ان

فرقہ وارانہ مسئلہ

شرائط و حالات کا تعین ہو سکے جن کے تحت مشترکہ انتخابات کا طریقہ مسلمانوں کے لئے قابل قبول ہو جائے۔ چنانچہ

ستمبر میں ایک اتحاد کانفرنس شملہ میں ہوئی اور دوسری آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے زیر اہتمام اکتوبر میں بمقام کلکتہ ہوئی۔ خود کانگریس نے اپنے سالانہ اجلاس کے موقع پر "اتحاد کی تجویز" منظور کی اور پھر اخیر میں فروری ۱۹۲۸ء میں بمقام دہلی ایک "آل پارٹیز کانفرنس" (کل جماعتوں کی کانفرنس) منعقد ہوئی لیکن فرقہ واری مسئلہ کے حل کی طرف کوئی عملی قدم نہ اٹھایا جاسکا اور موخر الذکر کانفرنس بھی صرف ایک کمیٹی بنا کر برخاست ہوگئی جس کے سپرد اس معاملے کی مزید کارروائی کر دی گئی۔ مناسب یہ ہے کہ اس باب کو کانگریس کی اس تجویز کے ذکر پر ختم کیا جائے جو دسمبر ۱۹۲۷ء والے سالانہ اجلاس میں پیش ہوئی تھی اور جس میں یہ اعلان تھا کہ ہندستانیوں کا نصب العین کامل قومی آزادی ہے۔ اس اجلاس کا خاص واقعہ پنڈت جواہر لال نہرو کی ہندوستانی بساطِ سیاست پر دوبارہ آمد ہے۔ وہ حال ہی میں روس سے واپس آئے تھے اور یہ تحریک انھوں نے ہی پیش کی تھی۔ وقتی طور پر یہ تجویز بے اثر سی رہی، اور اس کے تھوڑے ہی دن بعد ان کے والد نے یہ اعلان کر دیا کہ ان کا نصب العین ہندوستان کے لئے نوآبادیاتی مرتبہ کا حصول ہے۔

جواہر لال نہرو

چوتھا باب

۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۵ء

موجودہ باب میں جن واقعات کا ذکر ہوگا وہ ہمارے اکثر ناظرین کی یاد میں ابھی تازہ ہوں گے - بہر حال ان آٹھ ہنگامہ آرا برسوں کا مناسب اختصار کے ساتھ احاطہ کرنے کے لئے ہمارے لئے یہ ضروری ہوگا کہ ہم اپنے بیان کو حتی الوسع مختصر بنائیں -

سائمن کمیشن کا ردعمل ۸ر نومبر ۱۹۲۷ء کو سائمن کمیشن کا اعلان ہوتے ہی پہلی بات تو یہ ہوئی کہ ہندستانی سیاست کے "دائیں اور بائیں" دونوں انتہا پسند جنھوں نے کمیشن کی ترکیب اور اس کے طریقۂ کار کی شترکہ طور پر مذمت کی تھی آپس میں مل گئے . بنیادی اعتراض یہ تھا کہ کمیشن کے اراکین سب کے سب اراکین پارلمینٹ تھے اور کوئی ہندستانی رکن نہیں لیا گیا تھا - بطور فوری کارروائی کے تجویز یہ ہوئی کہ کمیشن کا بائیکاٹ کیا جائے - لیکن جیسے جیسے دن گذرتے گئے بعض جماعتوں کا رویہ زیادہ ہوشمندانہ ہوتا گیا، بلکہ مجموعی حیثیت سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ جماعتیں جو اقلیتوں کی نمایندگی کر رہی تھیں کمیشن کے ساتھ تعاون کی تائید کرنے لگیں مسلمانوں میں

اس مسئلہ پر اختلاف رائے تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسٹر جناح
اور ان کے حامیوں نے جو کمیشن کا بائیکاٹ کرنا چاہتے تھے ایک جلسہ
کلکتہ میں کیا، اور سر محمد شفیع کی قیادت میں بہت سے ایسے
لوگوں نے جو اتنے انتہا پسند خیالات نہیں رکھتے تھے ایک اور جلسہ
لاہور میں کیا۔ کانگریس نے جیسا کہ توقع تھی اپنے سالانہ جلسہ میں یہی طے
کر دیا کہ "ہر طرح سے اور ہر نوبت پر کمیشن کا بائیکاٹ کیا جائے۔"
یہ وہ فضا تھی جس میں یکم فروری ۱۹۲۸ء کو اسمبلی کا اجلاس دہلی میں

۱۹۲۸ء کمیشن ہندوستان پہنچ گیا

شروع ہوا۔ ۲ر فروری کو مرکزی
اسمبلی کو مخاطب کرتے ہوئے ہز ایکسلنسی وائسرائے نے کمیشن کے
ساتھ تعاون کرنے کی ایک زور دار اپیل کی۔ دوسرے دن کمیشن کے اراکین
بمبئی میں اترے، ان کے استقبال کے لئے جو ہڑتال تجویز کی گئی تھی وہ
منظمین کے لئے مایوس کن ثابت ہوئی لیکن مدراس اور کلکتے میں غنڈہ گردی
کے نہایت افسوسناک مظاہرے ہوئے۔ دہلی میں سر جان سائمن اپنے ساتھیوں
سمیت ۴ر فروری کو پہنچے۔ یہاں بھی شور و شغب کے مظاہروں سے
ان کا استقبال کیا گیا۔ حالانکہ مظاہرہ کرنے والوں میں کثیر تعداد ایسے
لوگوں کی تھی جو صرف برائے نام اس سے واقف تھے کہ اس مظاہرے کا
مقصد کیا ہے۔ بلکہ جب سر جان اسٹیشن سے روانہ ہوئے تو سڑکوں پر
ان کے لئے تالیاں بجائی گئیں۔ ۶ر فروری کو انھوں نے وائسرائے کے نام
ایک طویل خط لکھا جو دوسرے دن شائع ہوا۔ اس میں انھوں نے اپنا

مشترکہ آزاد کانفرنس کا طریقہ مجوزہ طریق کار بتایا تھا جو مختصر طور پر یہ تھا کہ یہ کمیشن ایک "مشترکہ آزاد کانفرنس" کی حیثیت سے کام کریگا۔ جس کی صدارت وہ کریں گے۔ کانفرنس میں برطانوی اراکین کمیشن اور ہندوستانی مجلس مقننہ سے منتخب کئے ہوئے نمایندوں کی کمیٹیاں بھی ہونگی۔ وہ تمام مسائل جو حکومت ہند یا صوبائی حکومتیں اس کمیشن کے سامنے پیش کرنے کے لئے مرتب کریںگی نیز اس مواد کی توضیح و تفصیل کے سلسلے میں جو شہادتیں ہونگی وہ سب اس "مشترکہ آزاد کانفرنس" میں پیش کی جائیں گی۔ برطانوی اراکین کمیشن چونکہ بالکلیہ پارلیمنٹ کے سامنے ذمہ دار ہیں لہٰذا ان کو تو اپنی علیحدہ رپورٹ پارلیمنٹ کے سامنے لازمی طور پر پیش کرنا ہوگی۔ لیکن اس کا اہتمام بھی کیا جائے گا کہ مرکزی مقننہ کی مشترکہ کمیٹی نیز صوبائی کونسلوں کی مختلف کمیٹیوں کی رپورٹیں بھی برطانوی پارلیمنٹ تک پہنچا دی جائیں۔ سر جان سائمن نے اس پر بھی آمادگی کا اظہار کیا کہ اگر ہندستانی مشترکہ کمیٹی منظور کرے تو اس کی رپورٹ کو کمیشن کی رپورٹ کا ضمیمہ بنا دیا جائے گا۔ سر جان سائمن کے اس خط کی اشاعت کے دو تین ہی گھنٹے بعد سیاسی لیڈروں نے جو مقننہ کے اجلاس کے سلسلے میں دہلی میں موجود تھے حسب ذیل مشترکہ بیان شائع کیا:۔ "ہم نے اس

کانگرس کی طرف سے مخالفت طریقۂ کار کا بغور مطالعہ کیا ہے جو سر جان سائمن کے آج کے بیان میں مذکور ہے۔ لیکن ہم کو کمیشن کی ترکیب اور اعلان شدہ اسکیم پر جو اصولی اعتراض تھا وہ ہنوز قائم ہے۔ اس پر سر جان

سائمن کے اس اعلان کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ لہذا ان حالات میں ہم کو اپنے اس فیصلہ پر قائم رہنا چاہیے کہ اس کمیشن سے کسی صورت میں کسی نوبت پر ہم کوئی تعلق نہ رکھیں گے"۔

یہ صاف ظاہر تھا کہ ان لیڈروں کو اس اہم بیان پر غور و خوض کرنے کا کافی وقت نہیں ملا تھا، اور ان کا واحد مقصد یہ تھا کہ اخبارات میں سر جان سائمن کی تجاویز کی اشاعت کے ساتھ ہی کچھ نہ کچھ اپنی طرف سے بھی شائع ضرور کر دیا جائے تا کہ رائے عامہ پر سر جان سائمن کے بیان کا اچھا اثر نہ پڑنے پائے۔

۱۶ فروری ۱۹۲۸ء کو لالہ لاجپت رائے نے مرکزی اسمبلی میں یہ تحریک پیش کی کہ دستوری کمیشن کی ترکیب اور اسکیم اس ایوان کے لئے سراسر ناقابلِ قبول ہے۔ اور اسمبلی کو اس کمیشن سے کسی نوبت پر اور کسی صورت میں تعلق نہ ہوگا۔ دو دن کے مباحثہ کے بعد ۶۸ اور ۶۲ کے قلیل فرق سے یہ تجویز منظور ہو گئی۔ چند ہی روز بعد کونسل آف اسٹیٹ میں ۱۲ کے مقابلہ میں ۳۴ رایوں سے ایک تجویز منظور ہوئی جس میں حکومت سے اصرار کیا گیا تھا کہ سائمن کمیشن سے تعاون کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی جائے۔ جہاں تک صوبوں کا تعلق ہے سوا صوبہ متوسط کے ہندوستان کی تمام صوبائی کونسلوں نے ۱۹۲۸ء کے موسم سرما تک یہ تصفیہ کر لیا کہ دستوری کمیشن سے تعاون کرنے کے لئے اپنے اراکین کی ایک کمیٹی بنائیں گی۔

صوبائی تعاون

۲۹-۱۹۲۸ء کے دوران میں کمیشن نے سارے ہندوستان کا دورہ کیا۔ اور بعض بعض جگہ مخالفانہ مظاہرے بھی ہوئے۔ ۱۳ر اپریل ۱۹۲۹ء کو کمیشن اپنے کام کی پہلی منزل ختم کر کے انگلستان واپس گیا۔ اس دوران میں یعنی ۱۹۲۸ء کے سال بھر سیاسی توجہ تمام تر دو امور پر مرکوز

ہندو مسلم تعلقات

رہی۔ ایک تو دستوری اصلاحات اور دوسرے ہندو مسلم تعلقات۔ ۳۱ر مارچ ۱۹۲۸ء تک ختم ہونے والے سال کے آخری چھ مہینوں میں سوا ایک بمبئی والے شدید ہنگامے کے جو ۲ر فروری کو شروع ہوا اور کوئی پندرہ دن تک جاری رہا، فرقہ واری بلوے نہیں ہوئے۔ بمبئی کے بلوے میں ۱۴۹ جانیں ضائع ہوئیں۔ اور زخمیوں کی تعداد ۷۳۹ تھی۔ ۱۹۲۸ء کا بقیہ زمانہ نسبتاً پُر امن رہا۔ دوسرے وجوہ کے علاوہ اس کا ایک ذیلی سبب یہ بھی تھا کہ مختلف فرقوں کے لیڈر زیادہ تر ان مسائل کی طرف متوجہ رہے جو دستوری کمیشن کی تحقیقات کے ضمن میں پیدا ہوئے۔ ہمارے اس کلیہ میں استثنائی صورتیں ضرور ہوں گی مگر عام طور پر دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ جس زمانہ میں فرقوں کو ان کی اپنی حالت پر چھوڑ دیا گیا اس زمانے میں ہنگامے بہت ہی کم ہوئے اور جس زمانے میں سیاسی ہنگامہ آرائی کا بازار گرم رہا اس زمانے میں فرقہ داری بلوے بھی بہت ہوتے رہے۔

نہرو رپورٹ

آل پارٹیز کانفرنس نے فروری ۱۹۲۸ء میں جو کمیٹی مقرر کی تھی اس کا اجلاس موسم گرما میں ہوا۔ اور بہت بحث مباحثہ کے بعد

ایک مختصر سی ذیلی کمیٹی بنائی گئی تاکہ ہندوستان کے لئے ایک دستور کے اصولوں
کا تعین کرے اور اس پر اپنی رپورٹ لکھے تاکہ اس طرح وہ دونوں
مسائل قریب تر ہو جائیں جو عوام میں ہیجان پیدا کئے ہوئے تھے۔
یہ رپورٹ اگست ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی۔ اس پر آٹھ لیڈروں کے دستخط
تھے۔ جن میں کانگریس پارٹی کے لیڈر پنڈت موتی لال نہرو، لبرل جماعت
کے لیڈر سر تیج بہادر سپرو اور گورنر جنرل کی مجلس عاملہ کے سابق رکن
سر علی امام بھی شامل تھے۔ اس چیز کو یاد رکھنا بہت ضروری ہے اس لئے
کہ بعد کو یہ رپورٹ "نہرو رپورٹ" کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ رپورٹ
بجائے خود بہت اہم تھی اور بہت لوگ اس کو لارڈ برکن ہیڈ کے اس
چیلنج کا جواب تصور کرتے تھے جو انھوں نے ہندوستان کے سیاسی لیڈروں
کو دیا تھا کہ ایک ایسا دستور مرتب کر کے دکھاؤ جس پر ملک کے تمام مفاد
راضی ہو سکیں۔ اس رپورٹ کی بنیاد "نوآبادیاتی مرتبہ" کے اصول پر رکھی گئی تھی۔
اس رپورٹ پر غور کرنے کے لئے آل پارٹیز کانفرنس کا اجلاس ۲۸ اگست
کو لکھنؤ میں ہوا۔ اور مشکلات کی ابتداء جواہر لال نہرو کی اس ضد سے ہوئی
کہ ہندوستان کا نصب العین آزادیٔ کامل ہونا چاہئے نہ کہ "نوآبادیاتی مرتبہ"۔
کانفرنس نے بالآخر جو تجویز منظور کی اس میں درج کیا گیا تھا کہ "جن جماعتوں کا
نصب العین کامل آزادی ہے، ان کی آزادیٔ عمل پر پابندی عائد کئے بغیر
ہندوستان میں جو طرزِ حکومت قائم ہو وہ ذمہ دارانہ ہونا چاہئے اور کسی حالت
میں بھی کسی خود مختار نوآبادی کے طرزِ حکومت سے کمتر درجہ کا نہ ہونا چاہئے"

کانفرنس کے ختم ہوتے ہی بعض مسلمان لیڈروں نے اس رپورٹ پر بڑی سخت تنقیدیں شروع کر دیں۔ جس کے جواب میں ہندوؤں کی طرف سے بھی مطالبوں پر مطالبے شروع ہو گئے۔ ۱۹۲۸ء کے اجلاس مرکزی مقننہ واقع شملہ میں اس رپورٹ کو اسمبلی میں پیش کرنے کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا۔ چند روز بعد مسٹر جناح نے قطعی طور پر کہدیا کہ نہرو رپورٹ کو مسلمانوں نے قبول نہیں کیا ہے۔ بعد کو جب دسمبر ۱۹۲۸ء میں کانگریس کا اجلاس ہوا تو اور بھی گڑبڑ مچی۔ یہ اجلاس کلکتہ میں ہوا تھا اور اس سے چند ہی دنوں قبل آل پارٹیز کانفرنس کا ایک اور جلسہ ہو چکا تھا۔ کانگریس کے اس اجلاس کی ایک

مسٹر گاندھی کا سیاسیات میں واپس آنا

بڑی خصوصیت یہ تھی کہ مسٹر گاندھی کئی برس تک گوشہ نشین رہنے کے بعد کانگریس کی عملی سیاست میں پھر سے حصہ لے رہے تھے۔ ان کا پہلا کام یہ تھا کہ کانگریس کو دو جماعتوں میں تقسیم ہونے سے بچا لیں۔ یعنی ایک جو موتی لال نہرو کی قیادت میں قائم ہونے والی تھی اور دوسری ان کے پرجوش بیٹے جواہر لال نہرو کی سرکردگی میں۔ اس موقع پر مسٹر گاندھی نے اعتدال پسندی پر زور دیا۔ انھوں نے آل پارٹیز کانفرنس کے لئے ایک مسودہ تیار کیا جس میں نہرو رپورٹ کو منظور کر لیا گیا تھا مگر اس شرط پر کہ "اگر یہ دستور ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء تک یا اس سے قبل تسلیم نہ کر لیا گیا تو کانگریس بھی کسی طرح اس کی پابند نہ رہیگی۔" بعد میں انھوں نے اس دو سال کی میعاد کو جو پارلیمنٹ کو نہرو رپورٹ کو منظور کرنے کیلئے دی گئی تھی کم کر کے ایک سال کر دیا۔ کانگریس کی مجلس موضوعات Subjects Committee

پھر جو اس کے بعد ہی منعقد ہوئی ایک تجویز جس میں نوآبادیاتی مرتبہ کی مذمت کی گئی تھی اور آزادی کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ ۱۳۵ رایوں کے مقابلے میں ۹۷۴ رایوں سے مسترد کر دی گئی

مقننہ کے دہلی والے اجلاس میں جو ۲۸ر جنوری ۱۹۲۹ء کو شروع ہوا ہز ایکسلنسی والیسرائے نے اپنی تقریر ان الفاظ پر ختم کی :-

۱۹۲۹ء - اتحاد باہمی کے لئے وائسرائے کی اپیل

" میں ایک بار اور اراکین مقننہ پر اور ان کے توسط سے سارے ملک پر یہ ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ ۱۹۱۷ء کا اعلان، برطانوی باشندوں کے ایک مقدس عہد کی حیثیت سے اب بھی قائم ہے اور ہمیشہ قائم رہیگا کہ وہ ہر اس مدد کے لئے تیار ہیں جو ایک قوم دوسری قوم کو مکمل قومی سیاسی حیثیت حاصل کرنے میں دے سکتی ہے نیز یہ کہ یہ عہد کبھی توڑا نہیں جائے گا .... لہٰذا وہ لوگ جو یہ کہتے پھرتے ہیں کہ برطانیہ کی نئی پود اس فکر میں ہے کہ ۱۹۱۷ء کے اعلان کی اصلی اہمیت کو باتوں باتوں میں اڑا دے وہ درحقیقت چاہے قصداً یا بے ارادہ برطانیہ عظمیٰ کے مقصد کے بارے میں غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں اور اس طرح ان سوتوں میں زہر ڈال رہے ہیں جن سے ہندستان اور برطانیہ عظمیٰ کی مشترکہ حیات کی نشوونما اور آبیاری ہو رہی ہے۔ اگر ہندستانیوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جو دھوکے میں آ کر برطانیہ عظمیٰ پر

ایسی بے اعتمادی کرسکتے ہیں تو یقیناً برطانیہ عظمیٰ میں بھی ایسے بہت سے لوگ نکل آئینگے جو ایک ایسے بے بنیاد اور غیر شریفانہ الزام سے دل تنگ ہوکر ان لوگوں پر بے اعتمادی کرنے لگیں جو ہندستان کی حمایت میں آواز اٹھاتے ہیں۔"

دہشت انگیز جرائم ۱۹۲۹ء میں بہت سے دہشت انگیز جرائم ہوئے اپریل میں اسمبلی میں بم پھینکا گیا۔ اس کے چند ہی روز بعد اسمبلی کے صدر نے مسودۂ قانون تحفظِ عامہ پر جس کا مقصد کمیونسٹ (اشتمالی) باغیانہ کارروائیوں کے انسداد کے لئے اختیارات حاصل کرنا تھا، مزید بحث کو یہ کہکر روک دیا کہ اس بحث کے دوران میں ایسے معاملات لازمی طور پر زیر بحث آئینگے جو مشہور مقدمہ سازش میرٹھ کے سلسلے میں زیر تحقیقات عدالت ہیں چنانچہ وائسرائے کو مجبوراً اس بل کو آرڈیننس کے ذریعہ نافذ کرنا پڑا۔ ختم سال کے قریب لاہور میں انڈین پولیس کے افسر مسٹر سانڈرس قتل ہوئے۔ اس واقعہ کی بنا پر سازش لاہور کا مقدمہ چلا۔ ۲۳ر دسمبر کو دہلی کے قریب ہی وائسرائے کی اسپشل کو ٹرین سے اتارنے کی ناکام کوشش کی گئی۔

گول میز کانفرنس کا اعلان اس سال کا اہم ترین واقعہ یہ تھا کہ چار مہینے انگلستان میں رہنے کے بعد واپسی پر وائسرائے نے ۳۱ر اکتوبر ۱۹۲۹ء کو ایک جریدہ غیر معمولی کے ذریعہ یہ اعلان کیا کہ نو آبادیاتی درجہ ہندوستان کی سیاسی تمناؤں کی قطعی اور منطقی منزلِ مقصود تسلیم کیا گیا ہے۔ اور یہ کہ دستوری کمیشن کی رپورٹ شائع ہونے کے بعد ایک گول میز کانفرنس

منعقد ہوگی تاکہ پارلیمنٹ کے سامنے ملک کے آئندہ دستور کی تجویزیں پیش ہونے سے پہلے ہندستان کو اپنا نقطۂ نظر مناسب اور مکمل طور پر ظاہر کرنے کا موقع مل سکے۔ یہاں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ مئی ۱۹۲۹ء میں انگلستان میں قدامت پسند حکومت کی جگہ مسٹر ریمزے میکڈانلڈ کی قیادت میں لیبر جماعت نے لے لی تھی۔ اس خبر کا شروع میں تو ہندستان میں خاصہ خیر مقدم کیا گیا۔ لیکن کانگریس پارٹی نے ایک مرتبہ پھر روڑا اٹکا دیا۔ اوائل نومبر میں دہلی سے چند ممتاز سیاست دانوں نے ایک یادداشت شائع کی جس کا ایک محتاط فقرہ یہ تھا کہ "ہم کو توقع ہے کہ ہم ہز میجسٹی کی حکومت کو اپنا تعاون پیش کرنے کے قابل ہوسکیں گے۔" لیکن آگے چل کر چند شرائط بھی پیش کی گئی تھیں جو آئندہ کے لئے ایک بری فال تھیں۔ ختم نومبر تک لبرلوں، ہندو مہاسبھا والوں، مسلمانوں اور بمبئی اور مدراس کی جسٹس یا غیر برہمن پارٹی اور یوروپینوں کی طرف سے اس پیش کش کی جس کا دائسرائے نے اعلان کیا تھا متفقہ طور پر تائید ہوچکی تھی۔ ۲۳ر دسمبر ۱۹۲۹ء کو وسیرائے نے مسٹر گاندھی اور موتی لال نہرو نیز سر تیج بہادر سپرو، مسٹر جناح اور مسٹر پٹیل صدر اسمبلی سے ملاقات کی۔ لیکن ایک بے نتیجہ سی گفتگو ہو کر رہ گئی۔ اس کے بعد لاہور

لاہور کانگریس

مرکز توجہ بنا جہاں ایک ہفتے تک کانگریس کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوتا رہا اور اس کے خاتمہ پر ایک تجویز شائع ہوئی جس کو تفصیل کے ساتھ یہاں دہرا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے:-

"نوآبادیاتی درجہ کے بارے میں وائسرائے کے ۳۱ اکتوبر والے اعلان پر پارٹی لیڈروں (بشمول کانگریسیوں) نے اپنے دستخط سے جو یادداشت شائع کی ہے اس پر مجلس عاملہ نے جو کارروائی کی ہے نیز سوراج حاصل کرنے کی قومی تحریک کے تصفیہ کے لئے وائسرائے نے جو کوششیں کیں ان کو یہ کانگریس بنظر استحسان دیکھتی ہے۔ تاہم تمام سابقہ حالات کو پیش نظر رکھنے کے بعد نیز مہاتما گاندھی اور موتی لال نہرو اور دوسرے

گول میز کانفرنس مسترد

لیڈروں کی وائسرائے سے ملاقات کے نتیجہ کو دیکھنے کے بعد کانگریس نے یہ رائے قائم کی ہے کہ بحالات موجودہ گول میز کانفرنس میں کانگریس کی نمائندگی سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ لہٰذا اس تجویز کے مطابق جو پچھلے سال کے اجلاس کلکتہ میں منظور ہوئی تھی، کانگریس اعلان کرتی ہے کہ دستور کانگریس کی دفعہ ۱ میں "سوراج" کا جو لفظ استعمال کیا گیا ہے اس سے مطلب آزادی کامل ہے۔ نیز یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ نہرو کمیٹی رپورٹ کی ساری اسکیم بوجہ ختم میعاد کالعدم ہو گئی ہے۔ کانگریس کو امید ہے کہ آج سے تمام کانگریسی اپنی تمام تر توجہ ہندوستان کے لئے کامل آزادی حاصل کرنے میں صرف کریں گے۔ آزادی کی تحریک منظم کرنے کے پہلے قدم کے طور پر اور کانگریس کی پالیسی کو دستور کی تبدیلی سے زیادہ سے زیادہ مطابق بنانے کی غرض سے یہ کانگریس تجویز کرتی ہے کہ مرکزی اور صوبائی مجالس مقننہ اور تمام سرکاری کمیٹیوں کا مکمل بائیکاٹ کیا جائے۔ تمام کانگریسیوں اور غیر کانگریسیوں پر جو اس تحریک میں حصہ لے رہے ہیں

یہ لازم قرار دیا جاتا ہے کہ آئندہ کے انتخابات میں براہ راست یا بالواسطہ حصہ لینے سے قطعی محترز رہیں اور کانگریس مجالس مقننہ اور دیگر کمیٹیوں کے اراکین کو یہ ہدایت کرتی ہے کہ وہ مستعفی ہو جائیں۔ یہ کانگریس قوم سے کانگریس کے تعمیری پروگرام پر کاربند رہنے کی پرزور اپیل کرتی ہے اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ جس وقت مناسب خیال کرے خاص خاص علاقوں میں یا سارے ملک میں مناسب احتیاط کے ساتھ سول نافرمانی کا پروگرام شروع کر دے، جس میں عدم ادائی ٹیکس بھی شامل ہوگا"۔

یوں سمجھئے کہ کانگریس اپنی کشتی دریا میں ڈال چکی تھی۔ کانگریس نے اب باضابطہ طور پر اس تجویز ہی کو رد کر دیا جو مسٹر رنگا چاری کی ۱۹۲۴ء والی تجویز میں سوراجی پارٹی کی پیش کردہ ترمیم کی شکل میں پیش کی گئی تھی اور جس کی توثیق بعد کو بھی بار ہا کی گئی تھی کہ یہی "قومی" مطالبہ ہے۔ مگر جیسے جیسے دن گذرتے گئے اس کے آثار نمایاں ہونے لگے کہ کانگریس کے زیادہ معتدل اراکین لندن کی کانفرنس میں شرکت کا موقعہ ہاتھ سے کھو دینے کی پالیسی سے مطمئن نہیں ہیں۔ پھر یہ کہ وسیرائے کی پیش کش کو رد کرنے کے متعلق کانگریس کے فیصلہ نے اس اتحاد کو سخت ضرب پہنچائی جو کانگریس اور لبرلوں کے مابین دستوری کمیشن کے بائیکاٹ کے سلسلے میں ہو گیا تھا۔ چنانچہ آل انڈیا لبرل فیڈریشن نے اپنے سالانہ جلسے میں گول میز کانفرنس میں شرکت کے ارادے کا اعلان کر دیا۔

قرضوں کی واپسی سے انکار لاہور کی تجویزوں میں دو اور باتیں قابل غور ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ ان میں ایک ایسا اعلان کیا گیا تھا جو اگرچہ اس سے کئی برس پہلے بھی کیا جا چکا تھا مگر اس وقت کسی نے اس کو قابل غور ہی نہیں سمجھا تھا یعنی یہ کہ سوراج حاصل ہونے کی صورت میں ہندستانی قومی حکومت یہ حق اپنے لئے محفوظ رکھے گی کہ حکومت ہند کے ان قرضوں کی ادائی سے انکار کر دے جو اس کے نزدیک ملک کے مفاد کی خاطر نہیں لئے گئے تھے۔ اس موقع پر اس اعلان کا اثر پہلے کی بہ نسبت زیادہ ہوا۔

یوم آزادی: عہد کا تجزیہ دوسری وہ تجویز تھی جس کی رو سے سالانہ "یوم آزادی" منانے کی ابتدا کی گئی۔ یہ یوم پہلی بار ۲۶ جنوری ۱۹۳۰ء کو منایا گیا۔ ہندستان کی نئی نسلوں کو سکھایا گیا کہ ہر سال اسی تاریخ کو اس بیان کا ورد کیا کریں کہ "ہندستان میں برطانوی حکومت نے ہندستانیوں کو صرف آزادی ہی سے محروم نہیں کر دیا بلکہ ہندستان کو معاشی، سیاسی، تمدنی اور روحانی ہر طرح سے تباہ و برباد کر دیا" اس عہد کی حیرت انگیزی اتنی ظاہر ہے کہ اس کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کیونکہ برطانوی حکومت پر تو یہ بہت بڑا الزام ہے ہی۔ لیکن اگر یہ سچ ہے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ اس وقت خود ہندستانی لوگ معاشی، سیاسی، تمدنی اور روحانی اعتبار سے تباہ حال اور برباد ہیں اور یہ ایسی بات ہے جس کو عہد کرنے والوں میں سے کوئی بھی ماننے پر آمادہ نہ ہوگا۔ یہ عہد دراصل اس قسم کے بلند بانگ ادعا کی ایک مثال ہے جو دلیل کو ہٹا کر اس کی جگہ خود لے لیتا ہے۔

۱۹۳۰ء - سول نافرمانی کا آغاز لاہور کانگرس کے چند ہی ہفتے بعد مسٹر گاندھی نے پہلے تو ہندستان کو سول نافرمانی کے لئے ناموزوں قرار دیا۔ مگر پھر فوراً ہی اپنی رائے بدل دی اور ۱۲ر مارچ کو احمد آباد میں اس تحریک کی ابتدا اس طرح کی کہ نمک کا قانون توڑنے کے لئے سمندر کی طرف ایک جلوس لے گئے۔ بہت سے سربرآوردہ لیڈر مسٹر گاندھی کی اس حرکت کو دل سے برا سمجھتے تھے لیکن انھیں باز رکھنے کا کوئی مؤثر ذریعہ ان کے پاس نہ تھا۔ ۵ر اپریل کو وہ ڈانڈی کے ساحل پر پہنچ گئے اور باضابطہ تحریک شروع کی۔ جہاں تک اس تبصرہ کا تعلق ہے ہمیں اس تحریک کی تفصیلات میں پڑنے یا ان مختلف خلافِ قانون حرکتوں کے بیان کی ضرورت نہیں جو اس سلسلہ میں کی گئیں۔

مسٹر گاندھی کی گرفتاری صرف یہ کہدینا کافی ہے کہ مسٹر گاندھی ۵ر مئی کو گرفتار کر لئے گئے اور مقدمہ چلائے بغیر ان کو سلطنت کے قیدی کی حیثیت سے رکھ لیا گیا۔ ۳۰ر جون کو مجلس عاملہ کو خلافِ قانون جماعت قرار دیا گیا اور اس کے منصرم صدر پنڈت موتی لال نہرو اور چند اراکین کو گرفتار کر لیا گیا۔ تحریک کے ابتدائی تین مہینوں میں پچاس نہایت سخت قسم کے فسادات ہوئے۔ خصوصاً شولاپور میں جہاں مارشل لا جاری کرنا پڑا اور پھر اس کے بعد تو ـــــ حالات کے لحاظ سے ۱۹۴۲ء کے فسادات کے مثل بموں اور دہشت انگیزیوں کی روز افزوں وارداتیں ہونے لگیں۔

بلوے ۱۸ر اپریل کو چٹگاؤں کے اسلحہ خانوں پر حملہ ہوا جس کا اہتمام مقامی کانگرس کے دفتر نے کیا تھا۔ کلکتہ کے پولیس کمشنر سر چارلس ٹیگارٹ پر

بم پھینکے گئے۔ بنگال کے انسپکٹر جنرل پولیس مسٹر لو مین کو قتل کر ڈالا گیا۔
کرنل سمپسن کو بنگال سکریٹریٹ میں گولی مار دی گئی اور لاہور میں ایک

ہنگامے

فوجی افسر کی بیوی مسز کرٹس کو بے دردی کے ساتھ مار ڈالا
گیا۔ ان کے دونوں بچوں کو زخمی کیا گیا۔ جیسا کہ ایسے موقعوں پر عموماً ہوتا ہے
ان ہنگاموں میں بہت سے بے گناہ لوگوں کو تکلیف اور نقصان پہنچا۔ سب ہی
صوبے اس تحریک سے متاثر ہوئے۔ مگر کہیں بھی نظم و نسق معطل نہ کیا جا سکا۔
اور حکومت اور ملازمین سرکار سخت بار کے باوجود ملک بھر میں اپنے فرائض
حسب معمول انجام دیتے رہے۔ اس وقت یہاں اتنی گنجائش تو نہیں کہ ہر
صوبے کے واقعات تفصیل سے بیان کئے جائیں جن میں سے بہت سے تو
ایسے ہیں ۔۔ خصوصاً صوبہ سرحد میں سرخپوشوں اور خدائی خدمتگاروں کے
کارنامے ۔۔ کہ ان کے لئے علیحدہ باب لکھنے کی ضرورت ہے۔ خاص نکتہ یہ ہے
کہ جیسا کہ اور ہر موقع پر ہوتا رہا، اس تحریک کا حاصل بھی تکلیفوں اور
نقصانات کے سوا اور کچھ نہ تھا، اور ارباب حکومت کو عارضی طور پر
شدید پریشانیوں کا چند روز سامنا رہا۔

اسمبلی کے چوتھے انتخابات

۱۹۳۰ء کے موسم سرما میں مجلس مقننہ کی
میعاد (جس میں ایک سال کا اضافہ کر دیا گیا تھا) ختم ہو گئی۔ کانگریس کی طرف سے
جدید انتخابات کا بائیکاٹ ہوا۔ چنانچہ نئی یعنی چوتھی اسمبلی میں جس کا اجلاس
جنوری ۱۹۳۱ء سے شروع ہوا۔ اس پارٹی کا کوئی نمائندہ نہ تھا۔ اس عرصہ

پہلی گول میز کانفرنس کا اجلاس

میں جون ۱۹۳۰ء میں سائمن کمیشن

کی رپورٹ شائع ہوگئی۔ پہلی گول میز کانفرنس کے ڈیلیگیٹ موسم خزاں کے آغاز میں انگلستان روانہ ہو گئے۔ اور ۱۲ر نومبر کو سینٹ جمیس پیلیس میں کانفرنس کا باضابطہ افتتاح ہوا۔ اسی دن اصلاحات کے بارے میں حکومت ہند کا متفقہ مراسلہ شائع کر دیا گیا۔ اس کے بعد ہی ایک اور اہم اعلان والیان ریاست کی طرف سے وفاق کی تائید میں ہوا جس کے بعد "وفاقی تعلقات کی کمیٹی" (Federal Relations' Committee) کا کام تیزی سے چل نکلا۔ مگر اقلیتوں کی کمیٹی (Minorities' Committee) کسی سمجھوتے پر نہ پہنچ سکی۔ پہلی گول میز کانفرنس ۱۹ر جنوری سنہ ۱۹۳۱ء کو ختم ہوگئی۔ اس موقع پر وزیر اعظم نے جو اعلان کیا اور اس سے جو نتائج پیدا ہوئے ان کے متعلق ہم بعد میں بحث کرینگے۔

کانگریسی لیڈروں سے جیل میں گفت و شنید

تکمیل داستان کے لئے ہم کو پہلے ایک واقعہ کا حوالہ دینا ہے جو اس صورت حال سے بہت کچھ مشابہ ہے، جو ہندوستان میں پچھلے چند مہینوں (سنہ ۱۹۴۲ء) میں پیدا ہوگئی تھی۔ ۱۳ر جولائی سنہ ۱۹۳۰ء کو سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر جیکر نے وائسرائے کو لکھا کہ اپنے ملک کی خاطر اور حکومت کے لئے بھی وہ اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ صورت حال کی اصلاح کے لئے ایک کوشش کر دیکھیں اور وہ اس طرح کہ اس مسئلے پر تحریک کے بعض لیڈروں سے گفتگو کریں جن کی بابت انھیں یہ امید اور یقین ہے کہ وہ لوگ معمولی صورت حالات واپس لانے میں ضرور مدد کریں گے۔ ان دونوں حضرات نے مسٹر گاندھی، پنڈت موتی لال

نہرو اور پنڈت جواہرلال نہرو سے جیل میں ملنے کی اجازت مانگی تاکہ وہ اپنا نقطۂ نظر ان کے سامنے پیش کر دیں اور آئینی ترقی کا زبردست سوال پرسکون فضا میں حل کیا جا سکے۔ ہز ایکسلنسی والیسرائے نے اجازت دیدی اور ۲۳ جولائی سے ۵ ستمبر تک لبرل لیڈروں اور کانگریسی لیڈروں میں جیل میں گفت و شنید ہوتی رہی۔ نیز یہ کہ پنڈت موتی لال نہرو اور پنڈت جواہرلال نہرو کو نینی جیل سے یروڈا جیل تک جانے کی اجازت دی گئی تاکہ وہ مسٹر گاندھی سے مل سکیں۔ ۵ ستمبر کو دونوں لبرل لیڈروں نے اعلان کیا کہ مفاہمت کے لئے ان کی کوششیں ناکام رہی ہیں اور اس مراسلت سے جو دوسرے دن شائع ہوئی صاف ظاہر ہوگیا کہ شروع سے آخر تک کانگریسی لیڈروں نے اپنے "شرائط صلح" میں کسی قسم کی ترمیم گوارا نہ کی اور ان شرائط کی نوعیت ایسی تھی کہ ان کے متعلق یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ حکومت ان کو تسلیم کر سکتی ہے۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس موقع پر کانگریس کے ساتھ "مفاہمت" کے امکانات تلاش کرنے کا کوئی دقیقہ اٹھا رکھا گیا۔ اس طرح سے جو نتائج برآمد ہوئے ان کے پیش نظر کیا کوئی شخص جھوٹوں بھی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ آئندہ اس پالیسی سے زیادہ امید افزا نتائج کی توقع ہے۔

۱۹۳۱ء - وزیر اعظم کا اعلان

گول میز کانفرنس کے آخری اجلاس میں وزیر اعظم نے جو بیان دیا اس سے یہ پوری طرح واضح ہوگیا کہ برطانوی حکومت کی رائے میں ہندوستانی حکومت کی ذمہ داری مقننہ پر عاید کی جائے اور ایک کل ہند وفاق کا اصول تسلیم کر لیا جائے۔ اور

اصول بھی مان لیا جائے کہ عاملۂ مقننّہ کے سامنے ذمہ دار ہے - ایک عارضی عبوری دَور میں بعض دستوری تحفظات ضروری ہوں گے. لیکن برطانوی حکومت اس کا خاص طور پر لحاظ رکھے گی کہ یہ محفوظ اختیارات اس طرح مرتب اور استعمال کیے جائیں کہ اُن سے دستور کے ذریعہ مکمل ذمہ دار حکومت تک ترقی کرنے کے راستے میں کوئی خلل نہ پڑ سکے۔

گاندھی کی رہائی وزیر اعظم کے بیان کے ایک ہفتہ کے اندر ہی وائسرائے نے اعلان کیا کہ حکومت ہند نے مقامی حکومتوں سے مشورہ کر کے یہ طے کیا ہے کہ مسٹر گاندھی اور کانگرسی مجلس عاملہ کے دوسرے ارکین کو غیر مشروط رہائی دیدی جائے - تاکہ وہ آزادی کے ساتھ آپس میں بحث مباحثے کے بعد وزیر اعظم کے بیان پر غور کر سکیں۔ مسٹر گاندھی نے رہا ہوتے ہی بیان دیا کہ ان کا دل صاف ہے۔ فروری کے مہینہ میں انھوں نے اور ان کے ساتھیوں نے تصفیہ کیا کہ سول نافرمانی فوری طور پر ختم نہیں کی جائے گی۔ لیکن کانگرسی لیڈروں اور مسٹر تیج بہادر سپرو، مسٹر شاستری اور مسٹر جیکار کے درمیان طویل گفت و شنید جاری رہی۔ بالآخر ۱۴ر فروری کو مجلس عاملہ نے مسٹر گاندھی کو مجاز قرار دیا کہ وہ وائسرائے سے ملاقات کریں۔ ۱۷ر فروری سے ۵ر مارچ تک مسٹر گاندھی اور لارڈ ارون کے مابین پرائیوٹ ملاقاتوں کا

ارون گاندھی معاہدہ سلسلہ جاری رہا جو بالآخر دہلی کے سمجھوتے پر ختم ہوا، جسے ارون گاندھی معاہدہ بھی کہتے ہیں۔ اس معاہدے کے خاص نکات یہ تھے کہ سول نافرمانی کی تحریک کو موثر طریقے پر بند کر دیا جائے۔ جو لوگ اس

سلسلے میں گرفتار کیے گئے ان کی عام رہائی عمل میں آئے اور کانگرس گول میز کانفرنس میں شرکت کرے۔ کانگرسی لیڈروں سے مفاہمت کی اس زبردست کوشش کے دوران میں لارڈ اردن کا جو رویہ رہا اس کی وضاحت بڑی اچھی طرح اس تقریر کے حسب ذیل اقتباس سے ہوتی ہے جو انھوں نے جنوری ۱۹۳۱ء کو مقننہ میں کی تھی :-

زیادہ شاندار طریق کار

"یہ بھی اس زمانے کی ایک بہت افسوسناک بات ہے کہ مقاصد میں برائے نام اختلاف کے باوجود (اگر واقعی اختلاف ہو بھی) بعض لوگ ایسے طریق کار اختیار کرتے ہیں جو کم از کم میری رائے میں اس مشترکہ عام مقصد کی تکمیل میں مدد دینے کی بجائے الٹی رخنہ اندازی کرتے ہیں۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ جو لوگ اس پالیسی کے ذمہ دار ہیں کیا وہ اتنا نہیں کہہ سکتے کہ ایسا راستہ اختیار کریں کہ ایک طرف ان بدنما واقعات کے پیش نظر جو ہندستان میں واقع ہوئے اور دوسری طرف لندن کی کانفرنس کی امید افزا ترقی کے مدنظر ایک زیادہ شاندار طریق کار تلاش کیا جائے؟"

لارڈ ولنگڈن

اپریل ۱۹۳۱ء میں لارڈ اردن ہندستان سے رخصت ہوئے اور ان کی جگہ لارڈ ولنگڈن وائسرائے ہو کر آئے۔ دہلی کے معاہدے کی شاید سب سے نمایاں خصوصیت یہی ہے کہ اس کی بدولت مسٹر گاندھی نے کم از کم ایک بار تو دستوری میدان میں قدم رکھا۔ کراچی کانگرس نے بلا اختلاف رائے اس معاہدہ کی توثیق کر دی۔ لیکن سارے ملک میں کانگرسیوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ یہ معاہدہ ان کی بڑی فتح ہے۔ یا یہ کہ وہ

"التوائے جنگ" ہے۔ کوئی تین ہفتے کے اندر ہی کانپور کے وحشیانہ فرقہ داری فسادات شروع ہوئے جو اپنی شدت میں غالباً ان تمام فسادات سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر تھے جن کا اس تبصرہ میں ذکر کیا گیا ہے۔ یہ فسادات شروع

معاہدے کی خلاف ورزیاں

اس طرح ہوئے کہ کانگرسی کارکنوں نے مسلمان دکانداروں کو مجبور کرنا شروع کیا کہ بھگت سنگھ کی یادگار میں جسے دہشتناک جرائم کی سزا میں پھانسی دیدی گئی تھی، اور جس کی شجاعت اور ایثار "کو کانگرس کے اجلاس کراچی میں سراہا گیا تھا، ہڑتال منائیں۔ اس کے بعد صوبہ متحدہ میں پنڈت جواہر لال نہرو کی سرکردگی میں مزارعین کی شورش شروع ہوئی، اور صوبہ سرحد میں خان عبد الغفار خاں کی سرکردگی میں "سرخپوشوں" کی سرگرمیاں۔ غرض ان تمام باتوں نے مل کر بے چینی بڑھادی اور یہ شبہ پیدا ہوا کہ شاید کانگرس معاہدے کی شرائط کا پابند رہنا نہیں چاہتی۔

اس کے بعد مسٹر گاندھی نے حکومت کے خلاف شکایتیں شروع کیں۔ ان کی بنائی ہوئی فرد جرم (ان کے شکایت نامہ کا یہی نام رکھا گیا تھا) کا حکومت ہند پہلے ہی سے مدلل جواب دے چکی تھی۔ اس سے پہلے حکومت ان کی اس تجویز کو بھی مسترد کر چکی تھی کہ ایک ایسا مستقل ثالثی بورڈ قائم کیا جائے جو اس معاہدے کی تعبیر اور فریقین کی جانب سے شرائط کی تکمیل کے متعلق مسائل کا تصفیہ کرے۔ اس تجویز کے معنے یہ تھے کہ یہ معاہدہ معمولی قانون سے بالا اور برتر ہے اور یہ کہ حکومت اور کانگرس دو برابر کے فریق ہیں جن کے باہمی نزاع کا تصفیہ کرنے

کے لئے ایک ثالث کی ضرورت ہے۔ اگست میں مسٹر گاندھی نے شرائط معاہدہ کے خلاف، والسرائے کو مطلع کیا کہ موجودہ صورت حال میں ان کا لندن جانا ممکن نہیں ہے۔ اس کے بعد مسٹر گاندھی اور والسرائے کے درمیان مزید گفت وشنید ہوئی اور اگست کے آخر میں مسٹر گاندھی گول میز کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے لندن روانہ ہوگئے۔

گول میز کانفرنس میں گاندھی کی شرکت

مسٹر گاندھی کے پرجوش سے پرجوش معتقد بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ کانفرنس میں ان کی شرکت کامیاب رہی۔ فرقہ داری مسائل چاروں طرف سے کانفرنس کی کامیابی کا راستہ روکے ہوئے تھے۔ اور بالآخر اقلیتوں کی ذیلی کمیٹی کو بدرجۂ مجبوری یہ رپورٹ پیش کرنی پڑی کہ کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکا۔ مسٹر گاندھی برابر اڑے رہے کہ مسلمانوں، سکھوں اور یوروپینوں کے علاوہ وہ کسی اور اقلیت کے لئے علیحدہ حق انتخاب کی تجویز پر غور کرنا ہی نہیں چاہتے۔ اچھوتوں کے بارے میں ان کا اصرار رہا کہ وہ ہندو ہیں اور ان کو ہندو جاتی ہی میں شریک رکھا جائے۔ مسٹر گاندھی کی ضد سے مجبور ہوکر ڈاکٹر امبیدکر نے اچھوتوں کے لئے علیحدہ حلقہ ہائے انتخاب کا قطعی مطالبہ پیش کر دیا۔ یکم دسمبر ۱۹۳۱ء کو وزیر اعظم نے ایک مرتبہ پھر اعلان کیا کہ برطانوی حکومت اس پر تلی ہوئی ہے کہ عبوری دور کے لئے کچھ تحفظات کے ساتھ ہندوستان میں وفاقی ذمہ داری کی پالیسی ہی اختیار کی جائے۔ اس اعلان کو خاص اہمیت اس لئے بھی حاصل ہوگئی کہ اس عرصہ میں انگلستان میں لیبر حکومت کی جگہ نیشنل گورنمنٹ قائم ہوگئی تھی جس میں قدامت پسند جماعت کے کئی

وزیر بھی تھے۔

ہندوستان میں حالات کی ابتری اس دوران میں عدم ادائی ٹیکس کی مہم کی وجہ سے صوبہ متحدہ میں اور صوبہ سرحد میں بھی حالات بد سے بدتر ہوتے گئے اور دہشت انگیز جرائم کی کئی اور وارداتیں ہوئیں۔ ہمارا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ دہشت انگیزیاں کانگرس کی سول نافرمانی کی تحریک کا جزو تھیں بلکہ کانگرسی حلقوں نے تو بارہا گول الفاظ میں سہی لیکن پھر بھی ان کی سخت مذمت کی۔ لیکن اس قسم کی واردات کی کثرت گویا اس زمانہ کی خصوصیت بن گئی تھی۔ یہ باغیانہ جذبات کے مظاہرے تھے، جنھیں کانگرس نے ملک میں خطرناک طریقہ پر مشتعل کر دیا تھا۔ ۱۹۳۱ء میں مسٹر پیڈی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مدناپور کو مار ڈالا گیا۔ سر ارنسٹ ہاٹسن قائمقام گورنر بمبئی پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ مسٹر گارلک ڈسٹرکٹ جج علی پور کو گولی مار دی گئی، مسٹر کیسلس کمشنر ڈھاکہ ڈویژن کو زخمی کیا گیا۔ چٹاگانگ میں ایک فٹ بال میچ کے موقع پر خان بہادر احسن اللہ کو قتل کر ڈالا گیا، مسٹر ولیرز، صدر یوروپین ایسوسی ایشن پر قاتلانہ حملہ کیا گیا۔ اور مسٹر اسٹیونس، ڈسٹرکٹ میجسٹریٹ تپارہ کو دو نوجوان بنگالی لڑکیوں نے مار ڈالا۔

۱۹۳۲ء۔ گاندھی کی واپسی۔ سول نافرمانی کا دوبارہ آغاز دسمبر کے آخر میں مسٹر گاندھی واپس آئے۔ اور فوراً ہی انھوں نے وائسرائے کو لکھا کہ صوبہ سرحد، صوبہ متحدہ اور بنگال میں سرکاری عہدہ داروں نے جو کارروائیاں کی ہیں ان کے متعلق میں آپ سے گفت گو کرنا چاہتا ہوں۔ وائسرائے نے اپنے جواب میں صاف طور پر واضح کر دیا کہ وہ مسٹر گاندھی سے ملنے کو بالکل تیار

ہیں، بشرطیکہ جیسی کہ ان کو توقع ہے، کانگریس کی کارروائیوں میں مسٹر گاندھی کا کوئی ذاتی حصہ نہ رہا ہو، اور جو کچھ ہوا ان کی پسند یا مرضی سے نہ ہوا ہو۔ ساتھ ہی وائسرائے نے یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ وہ ان کارروائیوں کے متعلق کوئی گفت گو نہیں کرنا چاہتے جو ضروری سمجھ کر کی گئی ہیں۔ جواب میں مسٹر گاندھی نے لکھا کہ دریافت واقعات سے پہلے وہ اپنے ساتھیوں کی مذمت یا تردید نہیں کر سکتے اور ساتھ ہی سول نافرمانی کو پھر شروع کرنے کی دھمکی دی۔ ہز اکسلنسی نے مسٹر گاندھی کو مطلع کیا کہ "کوئی حکومت جسے اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کا ذرا بھی خیال ہو ایسی شرطوں کی پابند نہیں ہو سکتی جو کسی سیاسی ادارے کی طرف سے ایک خلافِ قانون عمل کرنے کی دھمکی کے ساتھ پیش کی جائیں"۔ اس پر مسٹر گاندھی نے سول نافرمانی دوبارہ شروع کئے جانے کا اعلان کر دیا۔

گاندھی کی گرفتاری اس موقع پر حکومت نے بہت جلد اور ہمہ گیر کارروائی کی۔ مسٹر گاندھی اور مسٹر ولا بھائی پٹیل کو ۴ جنوری کو گرفتار کر کے سلطنت کا قیدی (State Prisoner) بنا لیا گیا۔ دوسرے کانگریسی لیڈروں کو بھی جیل بھیج دیا گیا۔ چند آرڈیننس نافذ ہوئے جن کے ذریعہ خاص خاص موقتی اختیارات اربابِ حکومت کو دیدیئے گئے اور چند مہینوں کے اندر ہی اس دوبارہ چلائی ہوئی تحریک کی کمر توڑ دی گئی۔ سنہ ۱۹۳۰ء کی تحریک کے ابتدائی ہفتوں کے برعکس اس مرتبہ پولیس اور عوام کے مابین کسی شدید تصادم کی نوبت نہیں آئی۔ دہلی میں ۲۳ راپریل سنہ ۱۹۳۲ء کو کانگریس کا جو اجلاس ہونے والا تھا اسے ممنوع

قرار دیا گیا۔ مگر چند لوگ پولیس کی نظر بچا کر موقع پر پہنچ گئے، اور ایک شخص نے جلدی جلدی پانچ تجویزیں پڑھ دیں جنھیں بلا اختلاف رائے منظور قرار دیا گیا۔ کل کارروائی میں پانچ منٹ بھی نہیں لگے۔ ۱۹۳۲ء کے آخری نصف حصہ میں تحریک کا زور برابر ٹوٹتا گیا۔

ملک معظم کی حکومت اور فرقہ واری تصفیہ

اس دوران میں چند ہندستانی لیڈروں کی ایک یادداشت کے جواب میں، اور اس میں پیش کی ہوئی تجویز کی بنا پر، ملک معظم کی حکومت نے ۱۹ مارچ ۱۹۳۳ء کو یہ اعلان کیا کہ چونکہ مختلف فرقوں کے درمیان خود سمجھوتہ ہو جانے کا کوئی امکان نہیں ہے اس لئے فرقہ واری تصفیہ کی ذمہ داری حکومت اپنے اوپر لیتی ہے۔ جنوری کے آخر میں تین آئینی کمیٹیاں ہندستان پہنچ چکی تھیں اور انھوں نے اگلے مہینوں میں تندہی کے ساتھ اپنا کام کیا۔ ۲۷ جون ۱۹۳۲ء کو وزیر ہند نے اس

مسودۂ قانون اصلاحات پر مشترکہ مجلس منتخبہ

ارادے کا اعلان کیا کہ پارلیمنٹ کی ایک مشترک مجلس منتخبہ بنائی جائے جو قبل اس کے کہ مسودۂ قانون اصلاحات پیش ہو

تیسری گول میز کانفرنس

ٹھوس دستوری تجویزیں پیش کرے۔ لیکن گول میز کانفرنس کا ایک اور آخری اجلاس پھر ختم سال پر منعقد ہوا۔

فرقہ وارانہ تصفیہ

۱۷ اگست کو فرقہ وارانہ تصفیہ

(Communal Award) کا اعلان کیا گیا اور جیسی توقع تھی اس پر ہر طرف سے اعتراضات کیے گئے۔

فرقہ واری فسادات

۱۹۳۲ء کے شروع موسم گرما میں فرقہ واری فسادات بھی شروع ہو گئے تھے اور بمبئی میں ۱۴ر مئی سے ۵ر جولائی تک ۲۱۱ موتیں واقع ہوئیں اور ۲۶۰۰ سے زائد زخمی ہوئے۔ اس سال دہشت انگیزانہ سرگرمیوں کا سلسلہ بھی جاری رہا، اور ۹۷ وارداتیں درج ہوئیں۔ ۶ر فروری کو کلکتہ کے جلسہ تقسیم اسناد کے موقع پر ایک طالب علم لڑکی نے گورنر بنگال پر قاتلانہ حملہ کیا۔ ۳۰ر اپریل کو مسٹر ڈگلس ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ

دہشت انگیزی کے جرائم

مدناپور پر گولی چلائی گئی۔ وہ زخموں سے جانبر نہ ہو سکے۔ ۲۰ر جون کو ضلع چٹگاؤں میں کیپٹن کیمرون کو گولی ماری گئی۔ ۲۷ر جون کو مسٹر سین ایک ہندوستانی مجسٹریٹ کو جبکہ وہ ڈھاکہ میں اپنے مکان میں سو رہے تھے گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ ۲۹ر جولائی کو مسٹر ایلسن سپرنٹنڈنٹ پولیس کومیلا کو گولی ماری گئی جس کی وجہ سے وہ مر گئے۔ ۵ر اگست کو سر الفریڈ واٹسن ایڈیٹر اسٹیٹسمین پر قاتلانہ حملہ کیا گیا۔ ۲۲ر اگست کو ڈھاکہ میں مسٹر گراسبی اسپرنٹنڈنٹ پولیس پر گولی چلائی گئی۔ ۲۴ر ستمبر کو پہاڑتلی (چٹگاؤں) کے ریلوے انسٹیٹیوٹ پر ایک منظم حملہ کیا گیا، جس میں ایک ضعیف خاتون مسز سلیوان جان سے ماری گئیں اور ۱۳ مرد اور عورتیں زخمی ہوئیں۔ ۲۸ر ستمبر کو سر الفریڈ واٹسن پر ایک اور قاتلانہ حملہ کیا گیا۔ اور ۱۱ر نومبر کو مسٹر لیوک سپرنٹنڈنٹ راج شاہی جیل کو گولی سے

زخمی کیا گیا۔

گاندھی کا "مرن برت" ان حالات میں جبکہ سول نافرمانی کی تحریک مدھم پڑ رہی تھی اور مسٹر گاندھی کا بازار سرد پڑ رہا تھا، انھوں نے یرودا جیل میں ۲۰ ستمبر کو اس غرض سے "مرن برت" رکھنے کا فیصلہ کیا کہ اچھوت اقوام کی نمایندگی کا جو طریقہ تجویز ہوا ہے اُسے بدل دیا جائے۔ ڈاکٹر امبید کرنے اس برت کو "بڑا سیاسی کرتب" قرار دیا۔ اور دوسرے ناقدین نے اسے ٹوٹتے ہوئے وقار کو بحال کرنے کی ایک چال ٹھہرایا۔ حکومت نے اعلان کر دیا کہ اس کے اقدامات پر اس قسم کی حرکتوں کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ لیکن اس کی منظوری دیدی گئی کہ مسٹر گاندھی کو جیل سے نکال کر کسی موزوں خانگی مکان میں رکھ دیا جائے۔ ۲۰ ستمبر کو برت شروع ہوا اور چند روز کے بحث مباحثے کے بعد ایک تصفیہ ہوا

میثاق پونا جو "میثاقِ پونا" کہلاتا ہے۔ یہاں اس تصفیہ کی تفصیلات کا موقع نہیں، مگر اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اگر مسٹر گاندھی نے اُس موقع پر ضد سے کام نہ لیا ہوتا تو یہی نتائج گول میز کانفرنس میں حاصل کئے جا سکتے تھے۔ اس برت سے معلوم ہو گیا کہ مسٹر گاندھی اب بھی اس قسم کی ترکیبوں سے نہ صرف عوام بلکہ ان کے لیڈروں کے جذبات کو متأثر اور ان کی عقلوں کو مسخ کر سکتے ہیں۔ اس برت کے بعد ہی اچھوت اقوام کی بندشوں اور پابندیوں کو دور

اچھوت ادھار کی مہم کرنے کی مہم بڑے زور و شور سے شروع ہوئی۔ مگر اس میں بہت ہی کم کامیابی ہوئی۔ ظاہر ہے کہ ایک ایسا نظام جو قوم کی تاریخ و روایات میں اتنی گہری جگہ پیدا کر چکا ہو، جذبات کے

محض وقتی ہیجان سے نہیں ٹوٹ سکتا تھا۔ تاہم یہ مہم جاری رہی۔ الہ آباد میں ۳ سے ۲۵ نومبر تک ایک اتحاد کانفرنس ہوئی مگر متعلقہ فرقوں نے اس کے فیصلوں کی توثیق کرنے سے انکار کر دیا۔ جیل میں رہنے کے باوجود مسٹر گاندھی کو یہ سہولت دے دی گئی کہ وہ وہاں سے چھوت چھات کے خلاف پروپیگنڈا کر سکیں۔

پورے ۱۹۳۳ء میں حکومت کی پالیسی برابر یہ رہی کہ ایک طرف تو آئینی اصلاح کا کام جاری ہے اور دوسری طرف استقلال کے ساتھ امن عامہ قائم رکھا جائے۔ چنانچہ اس دوران میں دلچسپی اور توجہ کا مرکز کبھی انگلستان ہوتا اور کبھی ہندستان۔

۱۹۳۳ء۔ قرطاس ابیض کی اشاعت

آئینی ترقی کے سلسلہ میں سب سے اہم واقعہ قرطاس ابیض کی اشاعت ہے جو ۱۸ مارچ ۱۹۳۳ء کو ہوئی اور جس میں آئینی اصلاحات سے متعلق ملک معظم کی حکومت کی تجویزیں بتائی گئی تھیں حسب معمول اس پر تنقیدوں کی بوچھار ہوئی جو زیادہ تر ان "تحفظات" پر تھیں جو اس آئینی اسکیم میں مذکور تھے۔

کانگریس کی مخالفت

اگر گنجائش اجازت دیتی تو ان تحفظات پر تفصیلی نظر ڈالنا اور یہ بتانا کہ ان تحفظات میں سے ہر ایک کا تعلق کسی نہ کسی ایسی انتہاپسندی یا رخنہ اندازی سے تھا جس کا مظاہرہ گذشتہ دس پندرہ برس سے کانگرس کرتی آئی تھی دلچسپ ہوتا۔ بہت آسانی سے ثابت کیا جاسکتا ہے کہ یہ تحفظات در اصل کانگریس کی انھی حرکتوں کی بدولت وجود میں

آئے۔ اس موقع پر یہ بھی یاد رکھنا دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ انگلستان کی قدامت پسند جماعت کے دائیں بازو کی جانب سے آئینی اسکیم کی مخالفت روز بروز بڑھ رہی تھی۔ اور ایسی صورت میں یہ ثابت کرنا مشکل نہ ہوتا کہ مسٹر گاندھی اور ان کے پیرؤوں نے اپنی متواتر چالوں سے ان کٹر قدامت پسندوں کے ہاتھ اور مضبوط کر دیئے اور بہر صورت انہیں حسب دلخواہ انہیں اصلاحات کی مخالفت کا جواز مل گیا۔ تقریباً دس برس پہلے کی طرح اس مرتبہ بھی جیسے جیسے تحریک سول نافرمانی کمزور ہوتی گئی ملک میں چاروں طرف تعمیری کام اور سیاسی تعاون کا جذبہ پیدا ہونے لگا۔ کانگرس کی قانون شکنی کی تحریکوں کے لئے جو آرڈیننس نافذ ہوئے تھے ان کی خاص خاص دفعات مسودات قانون کی صورت میں مرتب ہوئیں اور قانون ساز مجلسوں نے انہیں منظور کر لیا۔ جن جماعتوں نے گول میز کانفرنس میں نمائندے بھیجنے سے انکار کر دیا تھا اب پارلیمنٹ کی مشترک منتخب کمیٹی میں اپنے نمائندوں کی شرکت کے لئے مضطرب نظر آنے لگیں۔ اس پورے سال ہندوستان میں اس کمیٹی کی کارروائیوں کا مطالعہ بڑی دلچسپی کے ساتھ کیا جاتا رہا۔

تحریک سول نافرمانی کا زوال جہاں تک کانگرس کی سرگرمیوں کا تعلق ہے، سول نافرمانی کی تحریک روز بروز رو بہ تنزل رہی۔ اس سلسلے کے خاص واقعے یہ تھے: مسٹر گاندھی نے مئی اور اگست ۱۹۳۳ء میں دو برت رکھے اور اس کے بعد وہ راست سیاسی کارروائیوں کو پس پشت ڈال کر اچھوت ادّھار کی تحریک میں محو ہو گئے۔ عمومی سول نافرمانی کی جگہ صرف انفرادی سول نافرمانی

رہ گئی ۔ اور اخیر سال میں پنڈت جواہر لال نہرو کا اشتراکیت (Socialism) یا اشتمالیت (Communism) کے پرچار کا جذبہ تیز ہو گیا۔

اچھوت ادھار کی مہم کی ناکامی اوائل ۱۹۳۳ء میں جب اسمبلی کا اجلاس نئی دہلی میں شروع ہوا تو دو غیر سرکاری بل "اچھوت ادھار" اور "مندروں میں داخلہ" کے بارے میں پیش ہوئے۔ مگر جو اراکین اس موضوع سے دلچسپی نہ رکھتے تھے یا اس کے مخالف تھے انھوں نے دوسرے غیر سرکاری بلوں پر مباحثہ کو اتنا طول دیا کہ ان بلوں پر بحث کی نوبت ہی نہ آنے پائی۔ اور جب شملہ میں اگست کے اجلاس میں ان میں سے ایک کو پیش بھی کیا گیا تو کوئی خاص دلچسپی کسی نے نہ لی۔ اس سے قبل ڈاکٹر امبیدکر نے ایک بیان میں کہا تھا کہ اچھوت طبقے مندروں میں داخلے کو زیادہ اہم نہیں سمجھتے بلکہ ان کو زیادہ فکر اپنی معاشی اور سماجی حیثیت کو ترقی دینے کی ہے۔

سیاسی قیدیوں کی شکایات اوائل اپریل میں کلکتہ میں کانگریس کا ایک جلسہ ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ اسے منعقد کرنے کی کوششیں کی گئیں لیکن ناکام کر دی گئیں۔ یہ امر لائق غور ہے کہ ہر پچھلے موقع کی طرح اس مرتبہ بھی جب سول نافرمانی ناکام ہونے لگی تو اس سلوک کو جو تحریک میں حصہ لے کر قصداً جیل جانے والوں کے ساتھ کیا جاتا ہے، شورش کا موضوع بنا کر جذبات کو مشتعل کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ چال کانگریس ہمیشہ ایسے وقت چلی ہے جبکہ فضا اس کے سازگار نہیں رہی۔

مسٹر گاندھی کا تین ہفتے کا برت اور رہائی

یکم مئی کو مسٹر گاندھی نے دفعتاً اعلان کیا کہ ان کا ارادہ ۸ مئی سے تین ہفتے کا برت رکھنے کا ہے۔ اس برت کا کوئی تعلق حکومت سے نہ تھا بلکہ وہ تمامتر ہریجن تحریک سے متعلق تھا اور ایک "واجب التعمیل اندرونی آواز" کی تعمیل میں رکھا جانے والا تھا۔ برت شروع ہوتے ہی حکومت نے اپنے اس فیصلے کا اعلان کیا کہ برت کی نوعیت اور مقصد نیز اس رجحان کے پیش نظر جس کا اس سے اظہار ہوتا ہے مسٹر گاندھی کو رہا کر دیا جائے گا۔ چنانچہ اسی روز وہ بلاشرط رہا کر دیئے گئے۔ سول نافرمانی عارضی طور پر چھ مہینے کے لئے ملتوی قرار دی گئی۔ بعد کو اس مدت میں مزید چھ مہینوں کا اضافہ کیا گیا۔ مسٹر گاندھی برت تو کاٹ لے گئے، مگر انھیں اچھا ہونے میں دیر لگی۔ ۲۴ر جون کو مسٹر آصف علی نے مسٹر گاندھی کے نام ایک کھلی چٹھی لکھی جس میں بتایا گیا تھا کہ اگرچہ سول نافرمانی کو ملک میں چودہ سال سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے مگر سیاسی مقاصد کے حاصل کرنے میں یہ تحریک قطعی ناکام رہی ہے اور اب اس کی بجائے کانگرس کو ایک "نئے مقصد کے لئے نئے جوشش" کی ضرورت ہے، اور اس کی صورت یہی ہے کہ مجالس مقننہ پر قبضہ جمانے کی کوشش کیجائے۔ یہاں پر پھر ہم تاریخ کو اپنا اعادہ کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ تمام صوبوں کے کانگرسی لیڈروں کی اس کانفرنس میں جو ۱۲ سے ۱۴ جولائی تک پونا میں ہوئی، پھر ایک بار مسٹر گاندھی کو اپنی جماعت کے اندر پھوٹ روکنے کے لئے زور لگانا پڑا۔ سول نافرمانی کو غیر مشروط

طور پر بند کر دینے کی ایک تجویز پیش ہو کر مسترد ہوئی - اسی طرح انفرادی
سول نافرمانی بھی ناکام رہی - ایک تیسری تجویز جس میں مسٹر گاندھی کو
مجاز قرار دیا گیا تھا کہ وائسرائے سے ملاقات کریں، منظور ہوئی لیکن وائسرائے
نے اس بنا پر ملاقات سے انکار کر دیا کہ سول نافرمانی کو ترک نہیں کیا گیا ہے۔
اس کے چند روز بعد ۱۴ر جولائی کو مسٹر گاندھی کا یہ اعلان پڑھ کر کانگریسیوں

انفرادی سول نافرمانی

کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ انھوں
نے کانگریس کے قائم مقام صدر مسٹر اینے کو مشورہ دیا ہے کہ تا اطلاع ثانی
سول نافرمانی بند کر دی جائے۔ اس کے بدلے پونا کی تجویز کے باوجود
انفرادی سول نافرمانی رکھی گئی ہے۔ مسٹر گاندھی کے الفاظ یہ تھے :-

> "اس تصور سے میرا دماغ چکراتا ہے کہ آزادی کی
> تلاش میں کونسلوں کا رخ کیا جائے۔ کونسلیں
> خاص خاص صورتوں میں ضرور کسی حد تک کارآمد ہو سکتی ہیں
> مگر یہی دلدلیں ہیں جو ملکی منزلِ مقصود کے راستہ میں حائل ہیں۔"

تمام کانگریسی ادارے عارضی طور پر ختم کر دیئے گئے البتہ صوبائی اور
کل ہند "ڈکٹیٹروں" کا سلسلہ جاری رکھا گیا، اور تمام کانگریسیوں سے توقع
کی گئی کہ وہ تعمیری سرگرمیاں جاری رکھیں گے۔ مسٹر گاندھی نے فیصلہ
کیا کہ وہ اپنا سابرمتی آشرم توڑ دیں گے اور اپنے چند ساتھیوں کو لیکر
ضلع کیرا کے ایک گاؤں کی طرف پیدل روانہ ہو جائیں گے اور راستے میں گاؤں
گاؤں انفرادی سول نافرمانی کا پرچار کرتے جائیں گے۔ اس پروگرام سے ان کا

صاف یہ مقصد تھا کہ سنہ ۱۹۳۰ء میں انھوں نے سمندر کی طرف جو تاریخی کوچ کیا تھا اس کی یاد تازہ کی جائے۔ لیکن ان کو فوراً ہی گرفتار کرکے پونا پہنچا دیا گیا

گاندھی کی دوبارہ گرفتاری

جہاں ان پر ایک حکم کے ذریعہ چند پابندیاں عائد کرکے انھیں رہا کر دیا گیا۔ لیکن ان کے یہ کہنے پر کہ وہ حکم کی خلاف ورزی کریں گے ان کو دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔ اور ۴ر اگست کو انھیں ایک سال کی قید محض کی سزا دی گئی۔ حکومت نے طے کیا کہ اب چونکہ ان کی حیثیت ایک سزا یافتہ مجرم کی ہے لہٰذا ان کو پہلے کی طرح سلطنت کے قیدی (State Prisoner) کے مراعات نہ مل سکیں گے۔ البتہ اتنی اجازت دی گئی کہ دن میں وہ دو ملاقاتیوں سے مل سکیں اور ایک مقررہ تعداد میں اخبار کے لئے مضامین لکھ سکیں۔ مسٹر گاندھی

ایک اور برت۔ رہائی۔ اور سیاسیات سے کنارہ کشی

مطمئن نہ ہوئے اور ۱۶ر اگست کو انھوں نے ایک اور برت شروع کر دیا۔ حالانکہ حالات کے اعتبار سے اسے "بھوک ہڑتال" کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ ۲۳ر اگست تک ان کی جان کے لالے پڑنے لگے اور طبی وجوہ کی بنا پر ان کو رہا کر دیا گیا۔ ان کے اس برت سے بہت کم دلچسپی کا اظہار کیا گیا اور رہائی کے بعد مسٹر گاندھی نے طے کر لیا کہ وہ اس سال بھر کسی سیاسی کارروائی میں حصہ نہ لیں گے۔ اس لئے کہ اگر وہ رہا نہ کر دیئے گئے ہوتے تو ۳ر اگست سنہ ۳۴ء تک ایک سال کی مدت تک وہ جیل میں ہوتے۔

اس سال کے بقیہ حصہ کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ مسٹر گاندھی اور مسٹر جواہر لال نہرو کے مابین (جو اکتوبر میں جیل سے رہا کر دیئے گئے تھے) مراسلت

ہوتی رہی، جس سے دونوں کے نقطۂ نظر کا اختلاف ظاہر ہوا۔ کانگرسیوں کو امید تھی کہ شاید پنڈت جی ایک ایسی پالیسی اختیار کرینگے جو واقعیت پر زیادہ مبنی ہوگی۔ مگر انھوں نے صرف اس نظریئے کے پرچار پر اکتفا کی کہ آزادی کے حصول کے لئے پہلے غرض مندانہ مفادات (Vested interests) کا چھین لینا لازمی ہے جس میں پہلا نمبر برطانوی حکومت کا ہے۔ پھر والیانِ ریاست اور آخر میں صاحبانِ دولت اور دوسرے مراعات یافتہ طبقوں کا۔

کانگرس کے اندر دستوری جماعت کا آغاز

اکتوبر کے آخر میں بمبئی اور مدراس کے کانگرسیوں کے چھوٹے گروہوں نے جب یہ دیکھ لیا کہ مسٹر گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو کو پارٹی کے پروگرام میں کسی تبدیلی پر راضی کرنا ممکن نہیں ہے تو انھوں نے اپنی علیحدہ جماعتیں بنانے کا فیصلہ کرلیا، جن میں سے ایک کا نام "ڈیماکریٹک سوراج پارٹی" تھا، اور دوسری کا "کانگرس سوراج پارٹی" اخیر سال میں سول نافرمانی کے عملی مظاہرے تقریباً نابود ہو چکے تھے۔ اس اثناء میں مسٹر گاندھی نے نومبر کے پہلے ہفتے میں اچھوت ادھار کے پرچار کے لئے سارے ہندستان کا دورہ شروع کیا۔ ختم سال تک وہ صوبہ متوسط، دہلی اور مدراس کا دورہ ختم کر چکے تھے۔ اس دورے میں ان کو کہیں کہیں کٹر سناتنی ہندوؤں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر عام طور سے ان کے جلسے حسب دستور بھرے ہوئے ہوتے تھے۔

دہشت انگیزی کے جرائم میں کمی

۱۹۳۳ء کی تاریخ کے تمت کے طور پر ہم اتنا اور بتا دیں کہ اس سال دہشت انگیزی کے جرائم

کی تعداد گھٹ کر ۳۴۳ رہ گئی تی۔جرائم میں سب سے زیادہ قابلِ لحاظ ۲ر ستمبر ۱۹۳۳ء کو مسٹر برج ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مدناپور کا قتل ہے جو ایک مقامی فٹ بال میچ میں حصہ لینے جارہے تھے کہ مارڈالے گئے۔

۱۹۳۴ء | اس رو داد کے اعتبار سے ۱۹۳۴ء کے اہم واقعات یہ ہیں :- ۷ر اپریل کو سول نافرمانی کی تحریک کا قطعی التوا ؛ اور اس کے بعد ہی کانگریس کا جو پچھلے ساڑھے چار سال تک خلافِ قانون سرگرمیوں کے تباہ کن تجربے کرتی رہی تھی دوبارہ آئین پسندی کی طرف رجوع ؛ آخر اکتوبر میں بمبئی میں کانگریس کا اجلاس۔اور اس کے بعد مسٹر گاندھی کی سیاسی سرگرمیوں سے کنارہ کشی ؛ ۲۲ر نومبر کو مشترکہ پارلیمنٹری کمیٹی کی رپورٹ کی اشاعت ؛ اخیر سال میں اسمبلی کے انتخابات جن کے بعد ۱۹۳۵ء میں نئی یا پانچویں اسمبلی وجود میں آئی۔

۱۹۳۴ء کے آغاز میں کانگریس پر وہی مدہوشی کی کیفیت طاری تھی جو مسٹر گاندھی جی نے پچھلے سال جولائی میں پونا میں پیدا کر دی تھی۔لیکن اب ہوش آنے کے آثار پیدا ہو چکے تھے۔ ۱۵ر جنوری کو بہار میں تباہ کن زلزلہ آیا جس کی تباہ کاریاں بجائے خود بہار کے سارے سیاسی اختلافات پر چھا جانے کے لیے کافی تھیں۔لیکن بہار کے باہر کانگریسی اخبارات اور قوم پرست سیاست داں زلزلہ کے اثرات کو بھی اپنے سیاسی مقصد کا آلہ کار بنانے سے باز نہ رہے۔

مسٹر گاندھی نے اپنا ہریجن پر چار والا دورہ ملتوی کر کے ۱۱ر مارچ کو

کسی قدر بعد از وقت بہار کا مختصر سا دورہ کیا۔ ۷؍ اپریل کو انھوں نے یہ اعلان

سول نافرمانی کا التواء

کیا کہ "حصول سوراج کے لیے جو نافرمانی جاری ہے وہ۔ نہ کہ وہ جو خاص خاص شکایتوں کے ازالہ کے لیے کی جائے۔ ملتوی کی جاتی ہے۔" اور اسی اعلان میں انھوں نے یہ عجیب و غریب بات بیان کی کہ آئندہ سے وہ اور صرف وہی سول نافرمانی کیا کریں گے اور انکی زندگی میں کسی اور شخص کو بغیر ان کی اجازت سول نافرمانی نہ کرنی چاہیے۔

اس کے بعد سے ہمیں سیاسی حالات میں عجیب افراتفری نظر آتی ہے۔ کونسلوں میں شرکت"۔ "اچھوت ادھار"۔ اور "راست کارروائی (کمیونزم کے چٹخارہ کے ساتھ)" یہ سب باتیں اپنے اپنے حامیوں اور ان کے پیرووں کے زبردست پرچار کا موضوع بنی ہوئی تھیں۔ یکم مئی کو سرکاری اعلان ہوا کہ ختم سال کے قریب اسمبلی کے عام انتخابات ہونگے، اس اعلان نے ان تمام کانگریسیوں کو یکجا کر دیا جو آئینی طور پر کام کرنے کے لیے واپس آنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ۱۷؍ مئی کو آل انڈیا کانگریس

کانگریس پارلیمنٹری بورڈ

کمیٹی نے اپنے اجلاس واقع پٹنہ میں یہ طے کیا کہ ایک پارلیمنٹری بورڈ بنایا جائے جو انتخابات کے لیے کانگریسی امیدوار چنے اور اسمبلی کے اندر کانگریسی نمائندوں کی پالیسی پر نگاہ رکھے۔

۶؍ جون کو حکومت ہند نے کانگریس پر سے امتناعی احکام اٹھا لیے، اور ۱۵؍ جون کو کانگریس کی مجلس عاملہ اور پارلیمنٹری بورڈ کے اجلاس بمبئی میں ہوئے۔ فرقہ وارانہ "تصفیہ" پر فوراً ہی اختلاف رائے پیدا ہو گیا

اور آخر کار مجلس عاملہ نے یہ عجیب وغریب تجویز منظور کی کہ " خاص فرقوں کے آپس کے اختلاف رائے کے سبب کانگرس اس وقت تک جب تک کہ یہ اختلاف رائے ختم نہ ہو جائے فرقہ وارانہ تصفیہ کو نہ منظور کر سکتی ہے اور نہ مسترد"۔ ایک طرف تو فرقہ واری سوال کی وجہ سے مسٹر اینے اور پنڈت مالویہ کی جماعتوں کے کانگرس سے علیحدہ ہو جانے کا خطرہ

کانگرس سوشلسٹوں کا وجود میں آنا

پیدا ہو گیا تھا۔ اور دوسری طرف اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہوئی کہ پنڈت نہرو کی نیم اشتمالی تبلیغ کے اثر سے ایک " کانگرس سوشلسٹ جماعت " قائم ہو گئی۔ پچھلے سال کے اخیر میں پنڈت جواہر لال نہرو کہہ چکے تھے کہ آج دنیا کے سامنے دو چیزیں ہیں جن میں سے اسے ایک اختیار کرنا ہے۔ ایک اشتمالیت Communism اور دوسری فسطائیت۔ اور میں کلیتہً اول الذکر کی تائید میں ہوں"۔ ٹھیٹ کانگرسی جماعت کے برعکس سوشلسٹ راست کارروائی جاری رکھنے کی تائید میں تھے "راست کارروائی" سے ان کی مراد ایسی نافرمانی تھی جس میں اہنسا کی تکلیف دہ شرط نہ ہو۔ مجلس عاملہ کے اجلاس بمبئی میں کانگرس کو پھر اپنا رنگ بدلنا پڑا۔ اور انھوں نے ایک تجویز منظور کی جس میں " مختلف مکتب خیال کی نمائندگی کرنے والی نئی جماعتوں کے قیام کے خیر مقدم کے ساتھ ساتھ خانگی املاک کی ضبطی کی گفتگو اور طبقاتی جنگ کی ضرورت کی مذمت کی گئی"۔ ۱۹ جون کو پونا جاتے ہوئے راستے میں مسٹر گاندھی کا استقبال سناتنیوں نے کالی جھنڈیوں سے کیا۔

اور ۲۵ جون کو ایک بم پونا کے میونسپل ہال کے پاس پھینکا گیا۔ خیال یہ تھا کہ یہ بم مسٹر گاندھی پر پھینکا جانے والا تھا۔ ان پر ایسے قاتلانہ حملے کی خبر نے عام سراسیمگی اور استعجاب پیدا کر دیا۔ مسٹر راج گوپال آچاری نے اخبارات کو ایک بیان دیتے ہوئے کہا "پونا کی واردات کے بعد تو ان لوگوں کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں جو اپنی نادانی کے باعث یہ رائے رکھتے ہیں کہ کسی اچھے مقصد کے حصول کے لئے تشدد جائز ہے۔ اور حقوق حاصل کرنے کی خاطر اسے گوارا کیا جا سکتا ہے۔"

اندرونی اختلافات

۴ اگست کو پنڈت مالویہ اور مسٹر اینے نے اعلان کیا کہ اسمبلی کے انتخابات لڑنے کے لئے وہ ایک علٰیحدہ "نیشنلسٹ پارٹی" بنائیں گے۔ غرض کہ اس فضا میں جبکہ ایک طرف تو سوشلسٹ ٹکڑی منحرف ہونے کی دھمکی دے رہی تھی، اور دوسری طرف مالوی جماعت کا الگ ہو جانا گویا یقینی تھا۔ ۷ ستمبر کو مسٹر گاندھی نے بالکل صاف صاف اعلان کر دیا کہ بمبئی میں اکتوبر میں ہونے والے اجلاس کانگرس کے بعد وہ کانگرس سے بالکل کنارہ کش ہو جائیں گے۔ اس اجلاس میں — جو کراچی کے جلسہ ۱۹۳۱ء کے بعد اب پہلی بار منعقد ہوا تھا — میدان ذاتی طور پر مسٹر گاندھی کے ہاتھ رہا۔ اس فضا میں جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے مسٹر گاندھی نے نیشنلسٹوں

بمبئی کانگرس، مسٹر گاندھی کی کنارہ کشی

اور سوشلسٹوں دونوں کو شکست دی مگر اس طرح کہ دونوں میں سے کوئی بھی کانگرس کے حلقہ سے باہر نہیں نکلا۔ کئی مسائل پر فیصلے عملی نقطۂ نظر سے نہیں

بلکہ مسٹر گاندھی کی خواہش کا احترام ملحوظ رکھ کر کیے گئے۔ کانگریس کے آئین میں ترمیمیں ہوئیں۔ ڈیلی گیٹوں کی تعداد چھ ہزار سے کم کر کے دو ہزار کر دی گئی اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اراکین کی تعداد ۱۶۶ کر دی گئی جو اس سے پہلے کی تعداد کا تقریباً نصف تھی۔ آخر میں ایک طول طویل تجویز کے ذریعہ **All India Village Industries Association** (انجمن برائے مصنوعات دیہی) قائم ہوئی۔ اس طرح گویا ایک بار اور مسٹر گاندھی کی ذاتی سیادت کا بول بالا ہوا، اور مخالف اور مخاصم قوتیں ایک ہی قیادت میں رہیں، اور وہ قیادت ان کی اپنی تھی۔ اسمبلی کی نشستوں کے لیے رائے دہی کا سلسلہ نومبر سے شروع ہوا۔ کانگریس کو ۴۴ نشستیں ملیں۔ مسٹر مالویہ

اسمبلی کے پانچویں انتخابات

کی نیشنلسٹ جماعت کو ۱۱، انڈیپینڈنٹ پارٹی کو ۲۲، اور یوروپین جماعت کو ۱۱۔ انتخابات کے اس نتیجہ کو "کانگریس کی زبردست فتح" سے تعبیر کیا گیا۔ مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ کانگریس کو اس کی وہ حیثیت دوبارہ مل گئی تھی جو ۱۹۳۰ء میں یعنی کونسلوں کو بائیکاٹ سے پہلے اس کو حاصل تھی۔ یہ اسمبلی ابھی چل رہی ہے۔

مشترکہ پارلیمانی رپورٹ کی اشاعت

۲۳ نومبر ۱۹۳۴ء کو مشترکہ پارلیمانی رپورٹ کی اشاعت صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ ساری سلطنت کے لیے بڑی اہمیت اور تاریخی دلچسپی کا واقعہ ہے۔ "قرطاس ابیض" کی اشاعت کو اٹھارہ ماہ سے زیادہ گذر چکے تھے اور اس عرصے میں صرف یہی نہیں ہوا کہ تحریک سول نافرمانی ختم ہو گئی بلکہ قدامت پرست **(Conservative)**

جماعت کے ایک طبقہ کی جانب سے اصلاحات کی بعض تجویزوں کی نوعیت اور وسعت پر سخت مخالفانہ رویہ کا اظہار کیا گیا۔ ان کی تائید برطانوی رائے عامہ کا ایک بڑھتا ہوا حصہ کر رہا تھا۔ ہندوستان میں اس رپورٹ کا خیر مقدم جس طرح ہوا اس کا اندازہ اس تبصرہ کو اتنا پڑھنے کے بعد ناظرین خود کر سکتے ہیں۔ مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی، سکریٹری پارلیمنٹری بورڈ نے فوراً ہی ایک بیان شائع کر دیا " کانگریس کا حکم صاف اور واضح ہے۔ کسی کانگریسی کو مشترکہ

کانگریس کی طرف سے مخالفت

پارلیمنٹری کمیٹی کی رپورٹ کے بارے میں کچھ کہنا نہیں ہے۔" اس بظاہر دو ٹوک اعلان کے باوجود دسمبر کو مجلس عاملہ کے اجلاس پٹنہ میں ایک غیر معمولی طویل تجویز کے ذریعہ اس رپورٹ پر اظہار خیال کیا گیا۔ اس تجویز میں پہلی مرتبہ دستور ساز مجلس (Constituent Assembly) کا ایک دھندلا سا نقش نظر آیا جس کے بارے میں کہا گیا کہ یہی ایک بدل ہے جو کانگریس پیش کر سکتی ہے۔ رپورٹ پر تنقیدوں اور اعتراضات کے اس ہڑبونگ میں بمبئی کے ایک نیشنلسٹ اخبار نے حسب ذیل الفاظ میں ساری کیفیت پوست کندہ بیان کر دی :۔

"کانگریس اور اعتدال پسند دونوں جماعتیں صرف "مسترد" اور "ناقابل قبول" کو تکیہ کلام بنائے ہوئے ہیں۔ لیکن ملک کے سامنے پیش کرنے کے لئے کوئی عملی پالیسی دونوں میں سے کسی کے پاس نہیں ہے۔ اگر سب اس بات پر متفق ہیں کہ نیا آئین عوام کی سیاسی حیثیت میں کوئی اصلاح نہیں کرتا تو حکومت کو

اس خیال میں رکھنا کہ آخر میں اسے بھی چلا لیا جائے گا،
ایک کھلی ہوئی غلطی ہے۔ برخلاف اس کے اگر سب اس پر متفق
ہیں کہ آئین جب نافذ ہوگا تو چار ناچار اس کو چلانا ہی پڑے گا۔
تو ایمانداری کے ساتھ اس کا اعتراف کیوں نہیں کرلیا جاتا؟ "

گاندھی اور انجمن مصنوعات دیہی

۱۹۳۴ء کا ذکر ختم کرنے سے پہلے مسٹر گاندھی کی تنظیم "انجمن مصنوعات دیہی" کا جائزہ بھی لے لینا چاہیے۔
اگرچہ اس تنظیم کے مسلمہ مقاصد صرف معاشی اور خدمتِ خلق سے متعلق تھے، لیکن حکومت نے یہ دیکھ لیا کہ یہ ادارہ آگے چل کر بڑی سیاسی اہمیت کا حامل بن جائے گا، حکومت ہند نے صوبائی حکومتوں کو اس بارے میں جو ہدایتیں ایک خفیہ گشتی مراسلے کے ذریعہ بھیجی تھیں وہ خلاف ضابطہ طریقے پر کسی طرح اخباروں کے ہاتھ لگ گئیں اور ان کی بناء پر دسمبر کے مہینے میں کسی نے ایک مستقل مضمون شائع کر دیا۔ اس انجمن کے بارے میں حکومت کے شبہات پر لوگوں نے بہت کچھ اعتراضات کیے۔ حکومت کی رائے کے صحیح ہونے کا ثبوت مسٹر ولبھ بھائی پٹیل کے ایک بیان سے ملتا ہے جو انھوں نے احمد آباد میں دیا۔ انھوں نے کہا:-

"ہم نے آزادی کی جنگ کو چھوڑا نہیں ہے بلکہ صرف جنگ کے طریقے بدل دیئے ہیں۔"

یہ بات واضح ہوگئی کہ مسٹر گاندھی ادھر تو یہ چاہتے تھے کہ کونسلوں پر کانگریسیوں کا قبضہ رہے اور ساتھ ہی اس فکر میں تھے کہ کانگریس کے باہر رہ کر معاشی جنگ

خود لڑیں چنانچہ انجمن مصنوعات دیسی کے ادارہ کا قیام یقیناً کسی آنے والی "آہنسائی جنگ" کا پیش خیمہ تھا۔

جناح نے دوبارہ مسلم لیگ کی قیادت سنبھالی

اس موقع پر ہم اس زمانہ کے دو متفرق واقعات بھی بیان کردینا چاہتے ہیں: ایک واقعہ تو یہ ہے کہ اس سال ۱۹۳۴ء میں مسٹر جناح دو برس قیام کے بعد، انگلستان سے واپس ہوئے اور انھوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت دوبارہ قبول کرلی۔ دوسرا واقعہ وہ قاتلانہ حملہ ہے جو ہز اکسلنسی سر جان اینڈرسن پر ۸ مئی کو لیبانگ کے گھوڑ دوڑ کے میدان میں کیا گیا۔ یہ کہنا بڑی حد تک درست ہے کہ بنگال میں اس سال دہشت انگیزی کی بلا مسلسل انسدادی کارروائیوں کی بدولت برابر کم ہونا شروع ہوگئی تھی۔ ۱۹۳۴ء کے آخری زمانے اور ۱۹۳۵ء کے ابتدائی زمانے میں ہندستانی فضا جتنی پُر امن تھی وہ برسوں سے دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔

۱۹۳۵ء

۱۹۳۵ء کے متعلق ہمیں کچھ زیادہ نہیں کہنا ہے۔ نئی مرکزی اسمبلی نے جس کا اجلاس ۲۱ جنوری ۱۹۳۵ء سے شروع ہوا مشترکہ پارلیمنٹری کمیٹی کی رپورٹ پر بحث کی اور فرقہ وارانہ تصفیہ کو "اس کی حد تک اور اس وقت تک کے لئے جب کہ اس کا کوئی ایسا بدل ہاتھ نہ آئے جس پر مختلف فرقوں کو اتفاق ہو" منظور کرلیا۔ اس اسمبلی نے یہ رائے بھی ظاہر کی کہ صوبائی حکومت کی اسکیم میں "بعض قابلِ اعتراض پہلو ہیں" جنھیں دور کردینا چاہئے، نیز یہ کہ مرکزی حکومت یا کل ہند وفاق کی اسکیم "بنیادی

طور پر اور کلیتہً ناقابلِ قبول ہے۔" ۱۲ رمئی کو کوئٹہ میں زلزلہ آیا اور ان شاندار امدادی خدمات کے باوجود جو برطانوی اور ہندستانی سپاہیوں نے اس موقع پر انجام دیں کانگرس اس تباہی کو بھی نسلی اور سیاسی پروپیگنڈا کے لیے استعمال کرنے سے نہ چوکی۔ یہ تو محض منفرد واقعات تھے جو برسبیل تذکرہ بیان ہوئے۔ لیکن اس سال کا خاص واقعہ یہ ہے کہ

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی منظوری

مسودۂ قانون حکومت ہند پارلیمنٹ میں ایک طویل مباحثہ کے بعد منظور ہوگیا۔ ۲ اگست ۱۹۳۵ء کو شاہی منظوری بھی حاصل ہوگئی۔ اور اس طرح ہندستان کے لیے ایک نئے آئین کے بنانے کا وہ عظیم الشان کام انجام کو پہنچا۔ جو اس وقت سے جب کہ ۱۹۲۸ء میں دستوری کمیشن نے اپنا کام شروع کیا، مرکز توجہ بنا ہوا تھا۔

پانچواں باب

سنہ ۱۹۳۵ء — سنہ ۱۹۳۹ء

ہمارے تبصرہ کے اس آخری دور کے واقعات پچھلے بابوں کے مقابلہ میں اور بھی زیادہ اختصار سے بیان کئے جا سکتے ہیں۔ یہ دور دو حصوں میں منقسم ہوتا ہے۔ ایک میں تو حکومت وہ تمام اہتمام اور تیاریاں کرتی رہی جو نئے آئین کو نافذ کرنے کے لئے ضروری تھیں، اور کانگریس پارٹی اس بحث مباحثے میں مشغول رہی کہ اس آئین کے چلانے میں کس حد تک تعاون کیا جائے۔ دوسرا حصہ تقریباً دو سال کی مدت پر حاوی ہے۔ اس عرصے میں کانگریسی حکومتیں پہلے چھ اور پھر سات صوبوں میں قائم ہوئیں۔ یہ دور اس وقت ختم ہوتا ہے جبکہ کانگریس نے موجودہ جنگ کے متعلق اپنے رویہ کی بناء پر اس ذمہ واری سے سبکدوش ہونے کا تصفیہ کر لیا۔

اصلاحات کے بارے میں کانگریس کا رویہ پہلے دور میں کانگریس کے بائیں بازو یعنی انتہا پسندوں کی مخالفت کے باوجود یہ بات صاف

ظاہر ہوگئی تھی کہ کانگریس کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ صوبائی مجالس مقننہ کے انتخابات میں حصہ لینے سے انکار کر دے اور آئینی طریقوں سے گریز کرتی رہے۔ لیکن جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھینگے عہدے قبول کرنے کا فیصلہ تو بالکل عین وقت پر بلکہ وقت گزرنے کے بعد ہی کیا گیا۔

کانگریس کی جوبلی

دسمبر ۱۹۳۵ء میں کانگرس کی جوبلی منائی گئی جس میں عوام نے کچھ ایسی زیادہ دلچسپی نہیں لی، البتہ کانگرس کی طرف سے ایک بہت طول طویل بیان شائع ہوا جس میں ان تمام کارناموں کا ذکر کیا گیا تھا جو کانگرس نے ۱۹۲۰ء کے بعد سے اب تک "جائز اور پر امن طریقوں سے" انجام دیئے تھے۔ یہ کارنامے کیا تھے اور ان کو حاصل کرنے کے جو طریقے اختیار کئے گئے وہ کس حد تک "جائز اور پر امن" کہے جا سکتے ہیں اس کا اندازہ اس روئداد کے پڑھنے والے خود کر سکتے ہیں۔

اوائل ۱۹۳۶ء میں ہز میجسٹی شاہ جارج پنجم نے وفات پائی۔ اس المناک سانحہ پر عوام نے جس قلبی افسوس کا اظہار کیا، نیز آنجہانی کی سلور جوبلی کے موقع پر مئی ۱۹۳۵ء میں وفاداری کے جو مظاہرے ہوئے تھے ان سے پتہ چلتا ہے کہ ہندستان کی ہر جماعت اور ہر مذہب والوں کے دل میں ان کے لیے کتنی عزت اور محبت تھی۔

۱۹۳۶ء۔ لارڈ لنلتھگو کی آمد

اپریل ۱۹۳۶ء میں لارڈ ولنگڈن ہندستان سے سدھارے اور موجودہ والیسرائے نے عہدہ سنبھالا۔ مقننہ میں لارڈ ولنگڈن کی رخصتی تقریر

کے موقع پر، نیز نئے وائسرائے کی پہلی تقریر کے موقع پر، دونوں دن کانگرسی حزب مخالف کے ارکان غیر حاضر رہے اور اس طرح انھوں نے گویا اپنی منتظم بداخلاقی کا ثبوت دیا۔

اپریل ۱۹۳۶ء میں کانگرس کے لکھنؤ کے جلسہ میں صدر پنڈت جواہر لال نہرو نے کہا تھا کہ "قانون حکومت ہند کی شرائط کے تحت عہدے قبول کرنے کے معنے یہ ہوں گے کہ ہم خود ان اعتراضات کی نفی کر رہے ہیں جو ہمیں اس پر ہیں۔ اور اس طرح ہم اپنے منہ آپ مورد الزام بنیں گے۔" لیکن اس کے باوجود سمجھوتا ہو گیا اور غالباً مسٹر گاندھی کے اشارے سے ہوا۔ حالانکہ انھوں نے کانگرس کی کارروائی میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ سمجھوتا یہ تھا کہ اس مسئلہ کو مناسب وقت کے لئے اٹھا رکھا جائے۔

کانگرس کا انتخابی اعلان

اگست ۱۹۳۶ء میں کانگرس نے اپنا انتخابی اعلان شائع کیا، جس میں بتایا گیا تھا کہ قومی احیاء کے لئے اولین شرط یہ ہے کہ برطانوی تسلط سے نجات پائی جائے۔ ہر ایسی جنگ میں ہندستان کی شرکت کی پرزور مخالفت کی گئی جو برطانوی سامراجیوں نے چھیڑی ہو۔ مجالس مقننہ میں کانگرسیوں کو بھیجنے کا مقصد یہ بتایا گیا کہ نئے آئین کا مقابلہ کر کے اس کو ختم کر دیا جائے۔ اس اعلان میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ مجالس مقننہ کے اندر اور باہر کانگرسیوں کی کوشش یہ ہوگی کہ عوام کو قوت دے کر ایسے حالات پیدا کریں جو آزادی کے لئے

ضروری ہیں۔ تفصیلی پروگرام میں ان باتوں کا بھی ذکر تھا: تمام انسدادی قوانین کی تنسیخ، سیاسی قیدیوں کی رہائی، حقیت اراضی کی اصلاح، قرضداری سے نجات، صنعتی مزدوروں کی زندگی کی بہبودی، کمترین طبقے کے لوگوں کو مساوی شہری حقوق اور جیل خانوں کے انتظام میں زبردست اصلاحیں۔ قیام وفاق کی کامل مخالفت کا اعلان بھی کیا گیا تھا۔

کانگرس کا سالانہ جلسہ دسمبر ۱۹۳۶ء میں فیض پور میں ہوا۔ اسی مہینے میں بادشاہ ایڈورڈ ہشتم تخت سے دست بردار ہوئے، اور بادشاہ جارج ششم تخت پر بیٹھے۔ اس اجلاس میں بھی نئے آئین کا مقابلہ کرنے اور اس کو ختم کر دینے کے عزم کا دوبارہ اظہار کیا گیا۔ انتخابی اعلان کی توثیق کی گئی اور کانگرسیوں کو تاکید کی گئی کہ وہ مجالس مقننہ کے اندر اور باہر ہر جگہ ایک قابل قبول آئین مرتب کرنے کے لیئے دستور ساز مجلس (Constituent Assembly) کا مطالبہ کریں۔ بعض ایسی تجویزیں بھی منظور کی گئیں جن میں عوام کو متنبہ کیا گیا تھا کہ اگر کوئی ایسی لڑائی چھڑ جائے جس میں برطانیہ بھی شریک ہو تو وہ ہندستان کے آدمی اور دیگر وسائل کے استعمال کئے جانے کی مقاومت کریں۔ یکم اپریل کو جو نئے آئین کے نفاذ کی تاریخ تھی قومی ہڑتال کا مطالبہ کیا گیا۔ بادشاہ کی تاج پوشی کی تقریبوں میں شرکت کی بھی ممانعت کی گئی۔ اگرچہ ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا گیا کہ اس اقدام سے بادشاہ سلامت کی ذات کے ساتھ عناد یا کسی بداخلاقی کا اظہار مقصود نہیں ہے۔

۱۹۳۷ء - صوبائی خود مختاری کے انتخابات

فروری ۱۹۳۷ء تک صوبائی مجالس مقننہ کے انتخابات مکمل ہو گئے اور معلوم ہو گیا کہ سوا پنجاب، سندھ، بنگال، آسام اور صوبہ سرحد کے اور تمام صوبوں میں کانگریس کی اتنی اکثریت ہے کہ وہاں کانگریسی حکومتیں قائم ہو سکتی ہیں۔ اسی مہینے کانگریس کی مجلس عاملہ کے ایک جلسے میں کانگریس کے اغراض و مقاصد کا اعادہ کیا گیا۔ یہ جلسہ اس لئے طلب کیا گیا تھا کہ صوبائی مجالس مقننہ کی کانگریسی پارٹی کی ہدایت کے لئے ایک مرکزی نظام قائم کیا جائے۔ یہ بھی طے ہوا کہ دیہاتوں سے لے کر اوپر تک کے تمام کانگریسی نظام میں باہمی ربط و ترتیب پیدا کی جائے۔ اس کے بعد دہلی میں ۱۸ مارچ ۱۹۳۷ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ ہوا جس میں وہ بدنام زمانہ تجویز منظور ہوئی جس کے ذریعہ کانگریسیوں کو ان صوبوں میں

عہدے قبول کرنے کے بارے میں کانگریسی وزارتوں کی شرطیں

جہاں ان کی اکثریت ہو، اس شرط پر عہدے قبول کرنے کی اجازت دی گئی کہ پارٹی کے ہر لیڈر کو اس کا یقین ہو، اور وہ اسے برملا بیان کر سکے، کہ آئینی سرگرمیوں میں صوبوں کے گورنر اپنے خصوصی اختیارات سے کام نہیں لیں گے اور اپنے وزیروں کے مشوروں کو بالائے طاق نہ رکھیں گے۔ اس کے بعد ہی فوراً ایک اجتماع (Convention) ہوا۔ جس میں صوبائی قانون ساز اور دوسرے اور لوگ بھی شریک تھے اور ہندستان کی آزادی کے لئے۔ اور کانگریس کے

مقاصد کی تکمیل کے لئے کوشش کرنے کا حلف لیا گیا۔

یہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ وہ خصوصی اختیارات جن کے استعمال پر کانگریس کو اتنا سخت اعتراض تھا در اصل اگر تمام تر نہیں تو کم از کم براہِ راست ان ہی کے گذشتہ افعال و اطوار کی بدولت وجود میں آ گئے تھے۔ بہر حال خصوصی اختیارات کے استعمال نہ کیے جانے کا مطالبہ کر کے مسٹر گاندھی نے حسب معمول اپنے لیے ایک بہت سازگار صورتِ حالات پیدا کر لی تھی۔ یعنی یہ کہ انھوں نے اپنے آپ کو کانگریس کے دونوں بازؤوں میں سے کسی کی تائید کا قطعی طور پر پابند نہیں بنایا۔ مطالبہ کا انجام کچھ بھی ہوتا، ان کو بہر حال اپنی مطلب براری کا پورا موقع مل جاتا۔ جو اطمینان وہ چاہتے تھے اگر وہ نہ دلایا جاتا تو وہ سارا الزام گورنروں کے سر رکھ دیتے" اور اگر مطالبہ میں کامیابی ہوتی تو انھیں ایک ایسی فتح ہوتی جس سے عہدے قبول کرنے کے باوجود بھی کانگرس کی لاج رہ جاتی۔ یہ یقین کرنا تو مشکل ہے کہ گورنروں کی طرف سے کسی اقرار کے بارے میں مسٹر گاندھی کو کوئی غلط فہمی ہوئی تھی، اس لئے کہ ایسے اقرار سے قانون حکومتِ ہند کا مقصد ہی فوت ہو جاتا۔ بہر حال جیسا کہ سب کو معلوم ہے نتیجہ یہ ہوا کہ یکم اپریل ۱۹۳۷ء کو پانچ صوبوں میں غیر کانگرسی وزارتیں قائم ہو گئیں اور بقیہ چھ میں اقلیتوں کے نمائندوں کو وہ ذمہ داری سونپ دی گئی جس کے قبول کرنے سے کانگرس نے انکار کر دیا تھا۔ مسٹر گاندھی کے نقطۂ نظر سے یہ چال کامیاب رہی۔ داہنیا بازو کا سارا عتاب "حکومت" اور اقلیتوں کی وزارتوں پر تھا اور بایاں

باز و بالکل مطمئن تھا۔ اور اب مسٹر گاندھی کے تمام پیرو مجبور تھے کہ ان ہی سے درخواست کریں کہ حضرت جس حالتِ تعطل میں آپ نے ہمیں ڈال دیا ہے اس سے نکلنے کا راستہ بھی خود ہی بتائیے۔

ان صوبوں کی آئینی صورتِ حال جہاں اقلیتوں کی وزارت تھی اخباروں کی بحثوں اور بے شمار بیانات اور ملاقاتوں کا موضوع بنی رہی اور بقیہ پانچوں صوبوں میں خاموشی کے ساتھ اور مبارک طریقہ پر کام شروع ہوگیا۔ ۲۲ رجون ۱۹۳۷ء کو ہز اکسلنسی وایسرائے نے ہندستان کے نام ایک پیام شائع کیا جس میں انھوں نے اس وقت کے آئینی مسائل پر روشنی ڈالی۔ یہ بتانے کے بعد کہ کیوں صوبوں کے گورنر وہ یقین آفرینی نہ کرسکے جس کا کانگرس نے مطالبہ کیا تھا انھوں نے بہت صاف طور پر واضح کر دیا کہ جو اختیارات اور ذمہ داریاں نئے آئین کی رو سے منتخب شدہ وزیروں کی طرف منتقل کی گئی ہیں وہ کتنی حقیقی ہیں۔ ساتھ ہی انھوں نے اپنی حکومت کی طرف سے نیز پارلیمنٹ کی جانب سے یہ مخلصانہ آرزو ظاہر کی کہ اختیارات کی یہ منتقلی بغیر کسی شبہ یا بے اعتمادی کے قبول کرلی جائے۔ اس اعلان کا اثر بہت گہرا ہوا اور

کانگرس نے عہدے قبول کئے

۷ رجولائی کو کانگرس کی مجلس عاملہ نے کانگرسیوں کو اجازت دیدی کہ وہ عہدے قبول کرلیں۔ رائے عامہ کا اثر اتنا قوی تھا کہ کانگرس اس کی خلاف ورزی نہ کرسکی۔ پھر بھی کانگرس کی مجلس عاملہ کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ شرافت کے ساتھ اپنی

ہار مان لے جس تجویز کے ذریعہ وزارتیں قبول کرنے کا فیصلہ کیا گیا اس میں برطانیہ اور ہندستان کے تعلقات کو جابر اور مجبور کے تعلقات کہا گیا تھا۔ اور بڑی تاکید کے ساتھ اور اسی پرانے فقرے میں اس کا اعادہ کیا گیا کہ وزارتیں محض اس مقصد سے قبول کی جا رہی ہیں کہ ایکٹ کا مقابلہ کیا جائے اور انتخابی اعلان کے پروگرام کو روبعمل لایا جائے۔

غرض کہ اتنے عرصہ اور اتنی کشمکش کے بعد کانگریسی وزارتوں نے اپنے کروروں ہموطنوں کی قسمتوں کی ذمہ واری سنبھال لی۔ لیکن عہدے قبول

مجلس عاملہ کا مستبدانہ تسلط

کرنے کے لئے سب سے بڑی شرط یہ رکھی گئی تھی کہ تمام کانگریسی وزارتوں پر کانگریس کی مجلس عاملہ کا مرکزی تسلط رہیگا۔ ان کانگریسی وزرائے اعظم کو جو واردھا میں ایک مربوط پالیسی بنانے کے لئے جمع ہوئے تھے یہ مشکل تجربہ کرنا پڑا کہ وہ ایک ایسی جمہوریت چلائیں جس پر ایک مطلق العنان استبدادی ادارہ مسلط ہو۔ ان کے سامنے بڑا کٹھن راستہ تھا، اور پھر یہ کہ ان کی مجلس ناظمہ کے ارکان خود آپس میں یک رائے نہ تھے۔ ہم اوپر بتا آئے ہیں کہ ایک کانگرس سوشلسٹ پارٹی معرض وجود میں آچکی تھی، اور اس کے اس وقت کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو کے نیم اشتمالی خیالات کا بھی ذکر کیا جا چکا ہے۔ وہ خود عہدے قبول کرنے کی سخت مخالفت کرتے رہے تھے اور اس پر طرہ یہ کہ انتخابات کی مہم کے وقت جو تقریریں انھوں نے کیں ان میں سوراج حاصل کرنے کے لئے انقلاب اور بغاوت کو ضروری ٹھہرایا گیا تھا۔ سوراج

سے ان کی مراد محض یہ نہ تھی کہ برطانوی حکومت کی جگہ ہندستانی عہدہ دار آجائیں بلکہ اس سے ان کی مراد "پنچایت راج" تھی۔ بالفاظِ دیگر ایک سوویٹ نظام! فیض پور کانگرس کی صدارتی تقریر میں انھوں نے یہ معنی خیز الفاظ کہے تھے:۔ "اگر جنگ یا اسی طرح کی اور بحرانی صورتیں پیدا ہو جائیں تو ہندستان بہت کچھ اثر ڈال سکتا ہے۔ کامیابی کی کنجیاں ہمارے ہاتھ میں ہیں صرف شرط یہ ہے کہ ہم ان کو صحیح طریقے سے گھما سکیں۔

لگان میں کمی"۔ "قرضوں کی منسوخی" اور "زمینداری کا خاتمہ"۔ ان نعروں کے ساتھ انھوں نے جو تحریک کاشتکاروں میں شروع کی تھی، اس میں مستقبل کی شورش کا سامان تھا۔ لیکن قانون اور امن عامہ کے میدان میں سب سے زیادہ اور بہت جلد پالیسی اور انتظامی عمل درآمد کا تصادم رونما ہوا۔ یہاں ہم کو حکومتوں کی

صوبائی خود مختاری کی رفتارِ ترقی

ان دقتوں سے بحث نہیں کرنا ہے جو ان کو "سیاسی قیدیوں کی رہائی"، "قانون شکن داروں پر سے پابندیاں اٹھانے" اور "سخت گیر قوانین" کو مسترد کرنے میں پیش آئیں۔ کانگرسی لوگ سالہا سال سے منظم حکومت کے خلاف رہتے چلے آئے تھے اور اب وہ کیا عوام اور کیا خواص سب اس پر بہت برہم تھے کہ کانگرسی پروگرام کو روبہ عمل لانے میں اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے اور جس نظامِ حکومت کو برا بھلا کہنا ان کو سکھایا گیا تھا اسی سے اب کام

لئے جلانے پر ان کو اعتراض تھا۔ پھر بھی خاصی ترقی ہوئی۔ گورنروں کی ہدایت بدستور زنانہ رہی اور اگرچہ حکومت کی ان کشتیوں کو کئی عارضی طوفانوں سے سابقہ پڑا مگر یہ چھ حکومتیں جن میں بعد کو (شمالی مغربی سرحدی صوبے کی) ساتویں حکومت بھی شامل ہو گئی تھی، ان تمام طوفانوں کو جھیل لے گئیں ہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ پنجاب کو چھوڑ کر دوسرے صوبوں کی بہ نسبت ان کے معاملات زیادہ سلجھے ہوئے رہے۔ فرقہ واری بلوے اور ہنگامے ختم نہیں ہوئے اور پہلے کی طرح اب بھی ان کی روک تھام مضبوط پولیس کے ذریعہ اور بعض اوقات فوج کی مدد سے کی گئی۔ شدید اعتراضات کے باوجود باغیانہ جرائم کی یادداشت میں مقدمہ چلانے کی نہ صرف منظوری دی گئی بلکہ اس کا جواز بھی پیش کیا گیا۔ ایک سے زیادہ صوبوں میں پولیس پر بھی نگرانی رکھنی پڑی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خود کانگرسی حکومتوں کو اب انھی بھوک ہڑتالوں اور مقاومت مجہول کی ایسی ہی دوسری چالوں کا مقابلہ کرنا پڑا جن کو پہلے وہ خود استعمال کرتے تھے اور جن کے مؤثر ہونے کا وہ لوگوں کو یقین دلا چکے تھے، زیر نظر دور کے ختم کے قریب — جون ۱۹۳۹ء میں — آل انڈیا کانگرس کمیٹی کو سخت اندرونی مخالفتوں کے باوجود ایک تجویز منظور کرنی پڑی تھی جس میں کانگرسیوں کو ممانعت کر دی گئی کہ پہلے سے متعلقہ صوبائی

کانگریسی کمیٹیوں سے اجازت لئے بغیر نہ خود سول نافرمانی کریں اور نہ اس کا انتظام کریں۔

اس دو سال کے عرصے میں زیادہ تر مسٹر گاندھی کی صحت اچھی نہیں رہی، مگر پس پردہ ان کی موجودگی ہمیشہ محسوس کی جاتی رہی، بلکہ اکثر موقعوں پر تو وہ اسٹیج کے عین بیچ میں نظر آتے تھے۔

۱۹۳۸ء۔ کانگریس ہائی کمانڈ

چونکہ ہمارے نقطۂ نظر سے کانگریس ہائی کمانڈ کا مستبدانہ تصرف ہی اس نازک دور کی سب سے بڑی خصوصیت رہا ہے، لہٰذا ہم کو کانگریس کی خانگی پالیسی اور اس کے اندرونی مسائل کی بحث کے لئے گنجائش ضرور نکالنا چاہئے۔ پنڈت جواہر لال نہرو ۱۹۳۶ء میں اور ۱۹۳۷ء میں صدر کانگریس رہے اور جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں ان کے ذاتی خیالات کو ہر مرتبہ غلبہ نصیب نہ ہوتا تھا۔ ۱۹۳۸ء کے شروع میں ان کی جانشینی

سبھاش بوس کا عروج

ایک ان سے بھی زیادہ انتہا پسند ہستی یعنی مسٹر سبھاش چندر بوس کے حصے میں آئی۔ مسٹر بوس کو جنوری ۱۹۳۲ء میں سول نافرمانی میں حصہ لینے پر نہیں بلکہ اس بنا پر گرفتار کیا گیا تھا کہ بنگال کے دہشت پسندوں سے ان کا تعلق تھا۔ ایک سال بعد ان کو خرابیٔ صحت کی بنا پر یورپ جانے کی اجازت دیدی گئی تھی۔ ان کے قیام یورپ کے زمانہ میں یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ وہ عام باغیانہ اقدام کی تائید میں ہیں۔ لہٰذا ان کو تنبیہ کر دی گئی تھی کہ

اگر وہ ہندوستان واپس آئے تو ان کو آزاد نہ رہنے دیا جائے گا۔
انھوں نے اس تنبیہ کی پرواہ نہ کی ۔ ۱۹۳۶ء میں
ہندوستان واپس آئے اور گرفتار کر لیے گئے ۔ تھوڑا عرصہ پونا جیل میں
گذارنے کے بعد ان کو دارجلنگ کے قریب کرسیانگ میں اپنے بھائی
سرت چندر کے مکان میں رہنے کی اجازت دیدی گئی ۔ اور کچھ رعایتیں
بھی ان کے ساتھ کی گئیں ۔ مارچ ۱۹۳۷ء میں ان کو آزاد کر دیا گیا۔
صدر کانگرس کی حیثیت سے ان کی کارروائیوں کو شروع ہی سے
کانگرس کے اعلیٰ طبقہ میں اچھی نظر سے نہ دیکھا جاتا تھا۔ لیکن ان کے
دور صدارت میں اگرچہ غالباً مسٹر گاندھی کی زبردستی سے یہ واقعہ
پیش آیا کہ صوبہ متوسط کی کانگرسی وزارت کے معاملات پر جو بہت دنوں سے
باعث تشویش بنے ہوئے تھے مجلس عاملہ نے ۲۶ رجولائی ۱۹۳۸ء کو ایک تجویز
منظور کی جس میں صوبہ کے وزیر اعظم ڈاکٹر کھرے کو فیصلے کی غلطی اور شدید
بے ضابطگی کا مرتکب ٹھہرا کر قابل ملامت قرار دیا گیا اور ان کو دو سال کے
لئے پارٹی سے خارج کر دیا گیا۔ اس تجویز پر ہر طرف سے حتیٰ کہ کانگرسی اخبارات
نے بھی سخت اعتراض کئے ۔ ملک میں ڈاکٹر کھرے کے ساتھ خاصی ہمدردی تھی
اور صوبائی معاملات میں کانگرس ہائی کمانڈ کی زبردستی کی مداخلت کو برا بھلا
کہا گیا ۔ ۱۹۳۸ء کے بقیہ زمانے میں یہ بات کئی بار ظاہر ہوگئی کہ مسٹر گاندھی
اور صدر کانگرس میں اختلاف رائے ہے ۔ جب ۱۹۳۹ء کے شروع میں مسٹر
سبھاش بوس دوبارہ صدر کانگرس منتخب ہوئے تو کانگرس کی دنیا میں

ایک ہلچل مچ گئی۔ کئی سال سے یہ مسلمہ دستور چلا آتا تھا کہ مسٹر گاندھی کا نامزد کردہ امیدوار ہی بلا مقابلہ صدر منتخب ہو جایا کرتا تھا۔ اس موقع پر انتخاب کنندوں نے تین امیدوار منتخب کئے تھے جن میں سے مولانا ابوالکلام آزاد گویا "سرکاری" امیدوار تھے۔ رائے دہی سے چند ہی روز قبل مولانا نے مسٹر پتابی سیتا رامیا کے حق میں اپنی دست برداری کا اعلان کر دیا۔ اب مسٹر سبھاش بوس نے جو شاید مولانا کے مقابلے پر کھڑے نہ ہوتے مسٹر گاندھی کی ذاتی اپیل کے باوجود مسٹر سیتا رامیا کے حق میں دست بردار ہونے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ جب انتخابات ہوئے تو تین ہزار رایوں میں سے مسٹر بوس کو دوسو کی کثرت رائے سے کامیابی حاصل ہو گئی۔ یہ دیکھکر مسٹر گاندھی نے اعلان کر دیا کہ مسٹر بوس کی کامیابی، ان کی شکست ہے۔ وہ نیز مجلس عاملہ، صوبائی وزارتوں اور کانگرس پارٹیز میں ان کے جتنے ساتھی ہیں وہ سب کانگرس سے الگ ہو جائیں گے، اور مسٹر بوس اور ان کی ٹولی کے لئے میدان خالی کر دیں گے۔ مسٹر بوس اب عجیب کشمکش و پیچ میں تھے۔ کیونکہ وہ خوب واقف تھے کہ مسٹر گاندھی کی تائید بغیر وہ کچھ نہ کر پائیں گے۔ ادھر مسٹر گاندھی کو خود بھی وہ حیثیت دوبارہ حاصل کرنا تھی جو عارضی طور پر دائیں بازو کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ عام طور پر یہ توقع کی جاتی تھی کہ خانگی معاملات سے توجہ ہٹانے کے لئے مسٹر گاندھی اب اپنی توجہ اس تحریک پر مرکوز کر دینگے جو دیسی ریاستوں کے خلاف بہت دنوں سے آہستہ آہستہ چل رہی تھی لیکن جو سنسنی خیز اقدام انھوں نے کیا اس کا کسی کو وہم و گمان بھی نہ تھا۔ یہ اقدام تھا

راجکوٹ کا برت | راجکوٹ کا مشہور "مرن برت" جس کی تفصیلات اور چار روز بعد وائسرائے کی مداخلت پر اس کا ترک کیا جانا، اس سے ہر شخص اتنا واقف ہے کہ یہاں اس کے مزید بیان کی ضرورت نہیں۔ ۲۲؍ فروری ۱۹۳۹ء کو کانگریس کی مجلسِ عاملہ کا وجود ختم ہو گیا۔ کیونکہ پندرہ میں سے بارہ ممبروں نے ایک مشترکہ خط کے ذریعہ اپنا استعفیٰ پیش کر دیا، جس میں صدر سے کہا گیا تھا کہ وہ اپنی کابینہ خود منتخب کریں، اور اپنی پالیسی پر چلیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک طویل بیان شائع کیا جس میں مسٹر سبھاش بوس پر حملے کئے گئے تھے۔ اس فضا میں جبکہ تمام تر توجہ راجکوٹ کی طرف مبذول تھی ۷؍ مارچ کو یعنی جس تاریخ مسٹر گاندھی کا برت ٹوٹا ہے، کانگریس کا اجلاس تری پورہ شروع ہوا۔ مسٹر بوس بیمار بن گئے اور اسٹریچر پر آ کر اجلاس میں شرکت کی۔ پنتھ کی تجویز جو مجلسِ موضوعات (Subjects Committee) میں ۱۳۵ کے مقابلے میں ۲۱۸ رایوں سے منظور ہوئی اور کھلے اجلاس میں بغیر رائے شماری پاس ہوئی وہ تھی جس میں مسٹر گاندھی کی پالیسی اور پروگرام پر قائم رہنے کی توثیق کی گئی تھی، اور مستعفی شدہ مجلس عاملہ کے کام پر اظہارِ اعتماد کیا گیا تھا۔ اسی میں صدر سے یہ درخواست بھی کی گئی تھی کہ وہ مہاتما کی خواہش کے بموجب ایک نئی مجلسِ عاملہ منتخب کریں۔ نئی کمیٹی کے لئے ممبروں کے انتخاب پر مسٹر گاندھی اور صدر کانگریس متفق نہ ہو سکے اور بالآخر

بوس کا استعفیٰ۔ فارورڈ بلاک | ۲۹؍ اپریل کو مسٹر بوس نے صدارت سے استعفیٰ دیدیا۔ یہ تھا وہ انتقام جو کانگریس کے ڈکٹیٹر نے اس شخص سے لیا

جو ٹھیک تین مہینے قبل نہایت باضابطہ طور سے اور بالکل جمہوری طریقے پر مگر اس ڈکٹیٹر کی خواہش کے خلاف ــ صدر کانگرس منتخب ہوا تھا۔ اپنے استعفے کے بعد مسٹر بوس نے کانگرس کے اندر ہی فارورڈ بلاک کے نام سے ایک مخالف پارٹی بنائی۔ اس پارٹی اور اس کے حامیوں کا انقلابی پروگرام آج سب کو خوب معلوم ہے۔ اس کا لیڈر آج علی الاعلان مجوری طاقتوں کی چاکری میں ان کا آلہ کار بنا ہوا ہے۔ لیکن مسٹر گاندھی نے جو کارروائی کی اور جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے وہ اس بنا پر نہ تھی کہ آئندہ چل کر مسٹر بوس اس رنگ میں نظر آئیں گے۔ اس دور کی ایک اور

کانگرس اور مسلم لیگ کی روزافزوں مخالفت

قابلِ توجہ بات مسٹر جناح کی قیادت میں مسلم لیگ کی کانگرس سے بڑھتی ہوئی مخالفت ہے۔ ۱۹۳۸ء میں مسٹر جناح اور پنڈت جواہر لال نہرو کے درمیان کانگرس اور لیگ کی مفاہمت کے امکان کے بارے میں خط و کتابت ہوئی تھی، مگر کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ یہ واقعہ تھا کہ چھ خالص کانگرسی وزارتوں میں تیس غیر مسلم وزیروں کے مقابلہ میں صرف پانچ مسلمان تھے، اور اس طرح کانگرس کا ایک کھلی ہوئی ہندو جماعت ہونا ظاہر ہو گیا تھا۔ جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا مسلم لیگ کا رویّہ سخت تر ہوتا گیا، اور جیسا کہ سب جانتے ہیں جنگ چھڑنے کے بعد جب کانگرسی وزارتوں نے استعفے دیئے تو مسٹر جناح نے سارے ہندستان کے مسلمانوں کو ہدایت کی کہ صوبوں میں کانگرسی راج کے "ظلم۔ استبداد اور ناانصافی" سے مسلمانوں کے نجات پانے پر

۲۲ دسمبر کو یومِ تشکرانہ منایا جائے۔ اب یہ کہ یہ الزامات سچے تھے یا نہیں اس پر بحث کی گنجائش ہے۔ لیکن کم سے کم یہ بات ضرور قابلِ غور ہے کہ جب صوبوں میں دو عملی حکومت کا خاتمہ ہوا تھا تو ایسی کوئی تقریب نہیں منائی گئی تھی!

کانگریس کا رویہ جنگ کے متعلق اس دور میں کانگریس پالیسی کا آخری پہلو جس کی جانب اب ہمیں توجہ کرنا ہے موجودہ جنگِ عظیم کے متعلق اس کا رویہ ہے جس کے آثار اس وقت پیدا ہو رہے تھے۔ ہم فیض پور کانگریس کی اس تجویز کا پہلے ذکر کر چکے ہیں جو جنگ چھڑنے کی صورت میں ہندستانی سپاہیوں اور دوسرے وسائل کے استعمال سے متعلق تھی، اور جس کے سلسلہ میں پنڈت نہرو نے یہ اشارے کئے تھے کہ ممکن ہے کہ اس جنگ سے ہندستان کو وہ موقع ہاتھ آجائے جو وہ چاہتے ہیں۔

ستمبر ۱۹۳۸ء میں یورپ میں صورتِ حال نازک ہوگئی، اور بالآخر میونخ کا معاہدہ ہوا۔ ہندستانی سیاسی لیڈروں اور اخباروں نے چیکوسلاواکیہ کے ساتھ بڑی ہمدردی دکھائی اور شرائط معاہدہ پر اظہار مایوسی کیا۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اس زمانے میں ایک واقف کار اہل الرائے نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ معاہدہ میونخ پر کانگریسی حلقوں کی مایوسی کی ایک وجہ شاید یہ خیال تھا کہ یورپ کی جنگ سے ہندوستان کو نقصان کم اور فائدہ زیادہ ہوگا۔ قوم پرستوں کو یہ توقع تھی کہ، خواہ امدادِ جنگ کے انعام کے طور پر ہو یا پریشان کن شورش سے احتراز

کرنے کے معاوضہ کی شکل میں، انھیں مزید آئینی مراعات حاصل ہوجائیں گی اور کارخانہ داروں اور زراعت پیشہ لوگوں کو قیمتوں اور منافع کے اضافہ کی قوی امید تھی۔ اس موقع پر مجلس عاملہ نے اپنی پالیسی کے متعلق کوئی بیان دینے سے قصداً گریز کیا، لیکن عام خیال یہی تھا کہ زیادہ تر اراکین مجلس عاملہ برطانوی حکومت سے سودا کرنے یعنی تعاون کے معاوضے میں آئینی مراعات حاصل کرنے کے حق میں ہیں اور مسٹر گاندھی اپنا نقطۂ نظر منوانے کی فکر میں ہیں یعنی یہ کہ اصول اہنسا کا تقاضا یہ ہے کہ اس جھگڑے سے دور رہا جائے۔ اس کے بارے میں یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ اگر یہ نقطۂ نظر مان لیا جائے تو کانگریسی وزارتیں زیادہ عرصہ تک برسرِ حکومت نہ رہ سکیں گی۔ اسلئے کہ جنگ کی صورت میں صوبوں کو بھی جنگی مساعی کے سلسلہ میں عملی سرگرمی دکھانی پڑے گی۔ اس کے بعد جب یہ تجویز سامنے آئی کہ قانون حکومت ہند میں ضروری ترمیم کرکے مرکزی حکومت کو یہ اختیار دیدیا جائے کہ وہ بصورتِ جنگ صوبائی حدود کے معاملات میں بھی عملاً کارروائی کرسکے، تو جنگ میں ہندستان کے تعاون کے سوال پر پھر بحث کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ کانگریسیوں کی تقریروں اور بیانات میں وسیع اختلافِ رائے پایا جاتا تھا۔ بعض کا خیال تھا کہ ہندستان کو برطانیہ کی مشکلات سے فائدہ اٹھانا چاہیے اور بعض نازی لیڈروں سے شدید نفرت کے اظہار کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے جاتے

تھے کہ وہ کسی ایسی جنگ میں مدد نہیں دے سکتے جس میں برطانوی سامراج کو بچانے کا سوال پیدا ہو۔ بعد کے واقعات کی روشنی میں یہ بہت عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ مسٹر گاندھی نے جولائی ۱۹۳۹ء میں "ہریجن" میں یہ لکھا تھا کہ اگر کوئی عمومی شورش شروع ہوئی تو وہ لازمی طور پر تشدد کی صورت اختیار کر لے گی، کانگرس کی بدنامی کا باعث ہوگی، اور کانگرس کا مقصد تباہ ہو جائے گا۔ اگست ۱۹۳۹ء میں جب ہندستانی فوجیں مصر اور سنگاپور بھیجی گئیں تو کانگرس کی مجلس عاملہ نے اپنے واردھا کے جلسہ میں ایک طویل تجویز منظور کی۔ جس میں کانگرس کا یہ عزم دہرایا گیا تھا کہ جنگ کو زبردستی ہندستان کے سر منڈھنے کی ہر کوشش کی مخالفت کی جائے گی اور مرکزی اسمبلی کے کانگرسی ممبروں کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اسمبلی کے اس اجلاس میں شریک نہ ہوں جو اوائل ستمبر میں ہونے والا تھا۔

اعلان جنگ

۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو جنگ کا اعلان ہوا۔ اور اسی پر ہماری یہ داستان ختم ہو جاتی ہے۔ اس جنگ سے ہندستان کو وہ آزادی حاصل کرنے کا جس کے لئے آج دنیا کی خیر کی قوتیں شر سے برسرپیکار ہیں جو عدیم المثال موقع ملا اس سے مسٹر گاندھی کی قیادت میں کانگرسی لیڈروں نے کس حد تک فائدہ اٹھایا یا ناجائز کام لیا ـــــ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس کے لئے علیحدہ بحث کی ضرورت ہے۔ جن کو اس سوال سے دلچسپی

ہے اور جو اس کے جواب سے اب تک واقف نہیں ہیں اُن کو یہ
جواب نہایت واضح طور پر ایک رسالہ میں ملیگا جس کا عنوان ہے
"کانگریس اور محوری قوتیں"۔ جس کسی نے بھی اس ساری داستان
کو آنکھیں کھول کر پڑھا ہوگا اس کے لئے جنگ کے متعلق کانگریسی
لیڈروں کا رویّہ اور دنیا پر اس کا جواز ثابت کرنے کے لئے
ان کی قلابازیاں اور کچھ نہیں تو تعجب انگیز تو نہ ہونگی۔

چھٹا باب ۶

خاتمہ

یہ سمجھنا کہ یہ تبصرہ کسی مخالف قومیت نیّت سے لکھا گیا ہے
اس مقصد کی بہت غلط تعبیر ہوگی جس کے پیش نظر اس کی تحریر عمل میں
آئی ہے، بلکہ اس کے برعکس اس تبصرے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ
ایک چھوٹی سی ٹولی کی بد انتظامیاں جس نے انڈین نیشنل کانگریس
کی پالسی اور طریق کار کو اپنی مٹھی میں لے رکھا ہے سالہا سال سے

حاشیہ ۱ گزشتہ بیس سال سے مسٹر گاندھی کے زیر اثر کوئی ایک درجن

ہندستان کے مقصد آزادی کو نقصان پہنچا رہی ہیں، عام طور پر بجا طور پر
خیال کیا جا سکتا ہے — اور بلا شبہ اس خیال کو خود کانگریسی
لیڈروں نے بڑی مستعدی کے ساتھ پختہ کرنے کی کوشش کی ہے۔
کہ حکومت کو مسٹر گاندھی کی زیر قیادت کانگرس کی کارروائیوں کے خلاف،
خود مسٹر گاندھی کے خلاف، اور ان کے خاص خاص کارندوں کے خلاف
وقتاً فوقتاً جو کارروائیاں کرنی پڑی ہیں وہ اس کا ثبوت ہیں کہ حکومت
ہندستان کی سیاسی ترقی کی مخالف ہے۔ لیکن اگر ایک مرتبہ صاف طور پر
واضح کر دیا جائے کہ ایسا نہیں ہے بلکہ انگلستان اور ساری دنیا میں
ایسے لوگ کثرت سے موجود ہیں جن کو ہندستان کی امنگوں سے سچی

بقیہ حاشیہ:۔ افراد کانگرس پالیسی کے اجارہ دار بنے بیٹھے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد ۱۹۲۳ء میں
صدر کانگرس تھے اور پھر ۱۹۴۰ء سے اب تک یعنی ۱۹۴۳ء تک وہی صدر ہیں۔ ۱۹۲۳ء سے ۱۹۴۰ء تک
بشمول مسٹر گاندھی گیارہ افراد صدر رہ چکے ہیں جن میں سے سات اب تک بقید حیات ہیں۔ ان سات میں سے
سب ساٹھ سال یا اس سے بھی زیادہ عمر کے ہیں اور ان میں سے چار اب بھی مجلس عاملہ کے رکن ہیں۔ مسٹر
گاندھی اب کانگرس کے معمولی رکن بھی نہیں ہیں۔ بقیہ دو پنڈت مدن موہن مالویہ اور مسٹر سبھاس بوس ہیں
مسٹر ستیہ مورتی آنجہانی جیسا ماہر دستور کبھی مجلس عاملہ کا رکن نہ بن سکا۔ مسٹر سی راجگوپال چاری کبھی صدر نہ ہو پائے
پندرہ ممبروں کی مجلس عاملہ میں جس کے نئے انتخابات ہر سال ہونے چاہئیں، ۱۹۳۲ء سے یعنی سول نافرمانی
کے ترک ہونے کے بعد سے اب تک صرف تیس آدمی پھر پھر کر منتخب ہوتے رہے ہیں ۱۹۳۶ء کے بعد سے
اراکین مجلس عاملہ کی فہرست میں صرف چار نئے نام نظر آتے ہیں اور ۱۹۴۰ء کے بعد سے جبکہ موجودہ
مجلس عاملہ کا انتخاب ہوا، کوئی نیا نام دیکھنے میں نہیں آیا۔ ان انیس آدمیوں میں سے جو اس
عرصے میں رکن عاملہ رہے ہیں سات کا انتخاب پہلی دفعہ آج سے بیس برس پہلے اور چار کا کم سے
کم پندرہ برس پہلے ہوا تھا۔ ۱۲۔ مصنف

ہمدردی ہے، اور حکومت کا کوئی اقدام ہندستان کے عام باشندوں
کے خلاف نہیں کیا گیا بلکہ ان طریقوں کے خلاف تھا جو نسبتاً ایک
ایسے چھوٹے سے گروہ کے حکم سے اختیار کیے گئے تھے جو بری طرح اور
اتنی مدت سے ہندستان کے سیاسی معاملات پر مسلط چلا آتا ہے۔ اگر
یہ سمجھ لیا جائے تو ہندستان اور برطانیہ کے آپس کے تعلقات کو سمجھنے
کے لیے بہت کچھ راستہ صاف ہو جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت سے
لوگ ایسے ہیں اور رہینگے جو یہ سمجھتے ہیں کہ گذشتہ پچیس برس کی کشمکش
ایک بہادرانہ جنگ ہے۔ جو ایک محکوم قوم بڑے جوش کے ساتھ ایک ایسی زبردست
سلطنت کے تسلط سے نجات حاصل کرنے کیلئے کرتی رہی ہے جو آسانی سے اس تسلط کو
چھوڑنا نہیں چاہتی۔ دوسری طرف ایسے لوگ بھی ہونگے جو اس کے بالکل برعکس
رائے رکھتے ہونگے یعنی اس ساری کشمکش میں جس کی تفصیل ہم نے بیان کی ہے ان کو
یہ نظر آتا ہوگا کہ ایک عظیم الشان قوم متواتر و مسلسل موانعات کے باوجود اس
عزم پر قائم رہی ہے کہ اپنے اختیارات چھوڑ کر ذمہ داری ایسے لوگوں کی طرف
منتقل کردے جن کے پسندیدہ منتخب لیڈر اسے قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔

اِن متضاد رایوں میں سے کسی ایک کے حق میں فیصلہ کرنا ہم خود ناظرین پر
چھوڑتے ہیں لیکن جن حضرات نے واقعات کے اس تسلسل کا بے لاگ مطالعہ کیا ہے
ان سے کم از کم یہ توقع رکھنا ہم اپنا حق سمجھتے ہیں کہ حسب ذیل سوالوں کا صاف سیدھا
جواب پیش کریں:۔

(۱) کیا یہ واقعہ ہے کہ نہیں کہ مسٹر گاندھی اور ان لوگوں نے جو اپنی قوت فیصلہ

ان کے ہاتھ بیچ چکے ہیں جو قدم کبھی سیاسی ترقی کے راستہ میں اٹھایا گیا، اس کی برابر مخالفت کی، اور اس کے بالکل برعکس جب کبھی مسٹر گاندھی کا اثر تھوڑی دیر کے لئے بھی کم یا زائل ہوگیا تو ایک ویسا ہی وطن پرست اور اتنا ہی سمجھدار طبقہ ایسا نکل آیا جس نے آئینی تعاون اور اس کے ذرائع سے ترقی کی منزلیں طے کرنے کی تائید کی؟

(۲) یہ واقعہ ہے کہ نہیں کہ مسٹر گاندھی یا ان کے ساتھیوں کی کوئی بھی تحریک کامیاب نہیں ہوئی اور سوا ہنگامے، بدنظمی، تشدد اور مصیبتوں کے کوئی عملی نتیجہ نہ نکلا؟ کیا خود مسٹر گاندھی نے ان لوگوں کے ہاتھوں کو بہت زیادہ مضبوط نہیں بنایا جنھوں نے ہندوستان کی آزادی کی ہمیشہ شدید مخالفت کی اور اس طرح خود ہندستانیوں کے معاملے کو کمزور بنا دیا؟

(۳) سیاسیات سے بالکل قطع نظر ان معاملات میں بھی — مثلاً فرقہ واری اتحاد اور چھوت چھات کا مسئلہ، ترک مسکرات، حتیٰ کہ چرخہ کاتنے میں، جہاں ان کو بغیر کسی قسم کی سرکاری مداخلت کے پوری پوری آزادی حاصل تھی، کیا مسٹر گاندھی نے کسی کام کو ہاتھ میں لے کر تکمیل تک پہنچایا ہے؟ کیا یہ نہیں ہوا ہے کہ انھوں نے ان میں سے ہر ایک تجویز کو ایک خاص حد تک چلایا اور پھر چھوڑ دیا؟

(۴) انسانی فطرت کو دیکھتے ہوئے اور یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ فریقین کی خواہش ہندوستان کو آزاد دیکھنا ہے، کیا یہ واقعہ نہیں ہے

کہ تعاونی طریقے اپنی اعلیٰ ترین شکل میں بقول ایک والئسرائے کے "زیادہ شاندار طریقے" ہوتے اور کمترین شکل میں بھی اُن سے اب کے مقابلہ میں کچھ زیادہ ہی نفع مل رہتا؟ اگر وہ طریقے استعمال کئے جاتے تو کیا ہندستان اپنی مطلوبہ منزل کی طرف اب سے کہیں زیادہ تیزی سے نہ بڑھ رہا ہوتا اور آج سیاسی محرومیوں اور تعطل کی دلدل میں ہاتھ پاؤں مارنے کی بجائے وہ نازیوں کے خلاف اس عالمگیر جنگ میں فخریہ اور آزادانہ حصّہ نہ لے رہا ہوتا؟

اگر ان سب سوالوں کا ایماندارانہ جواب نفی میں نہیں ہے تو یقیناً اب وقت آگیا ہے کہ اس پر غور کیا جائے کہ کیا ہندستان کے لئے یہ بہتر نہ ہوگا کہ وہ لیڈروں کی اس ٹولی سے پیچھا چھڑائے جنھوں نے اس کو اس بُری طرح ناکام و نامراد بنایا۔ ان لیڈروں کی ناکامی پر حکومت کو الزام دینے کی بجائے کیا یہ ممکن نہیں کہ ہندستان کسی ایک شخص یا ایسی جماعت کو منتخب کرلے جو ملک کو پسماندہ بنائے رکھنے کی بجائے آگے کی طرف لے چلے اور ان مہلک اور منفی عقیدوں کے بجائے جن کی بدولت پچھلے پچیس سال سے ہندستان کے لوگ اپنی مستحقہ ودیعت کو قبول کرنے کے نااہل ہوگئے ہیں ایک تعمیری پالیسی روبہ عمل لائی جائے؟

کہا جاتا ہے کہ مسٹر گاندھی اپنے زمانے سے سو برس آگے ہیں۔ ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو۔ اس کی تصدیق تو صدی گذرنے کے

بعد ہی ہو گی - اگر ایسا ہو بھی تو یہ بھی بالکل سچ ہے کہ ایک شخص جو اپنے زمانے سے اتنا آگے ہو' ایک ایسی دنیا میں جہاں ہم اس وقت رہ رہے ہیں' اور روزمرّہ کے کاموں میں ایک عملی لیڈر کی حیثیت سے اتنا ہی مفید ثابت ہو گا جتنا کہ وہ شخص جو اپنے زمانے سے ایک سو برس پیچھے ہو! اس وقت ہندستان کو نوجوان یا نوجوانوں کی ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے جو تخیل رکھتے ہوئے اسیرِ تخیلات نہ ہو' یعنی ایسے نوجوان جو معاملات کی موجودہ حالت کو دیکھیں اور ان کے متعلق حقیقت پسندانہ اندازہ کر سکیں' جن میں استقلال مزاج کے ساتھ ہی اتنی ہمت بھی ہو کہ جہاں مفاہمت کی ضرورت پیش آئے مفاہمت بھی کر سکیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خیر سگالی کی وسیع قوتوں کو یکجا کر سکیں جو بالآخر بے اعتمادی۔ شبہ اور نفرت کی سموم فضا کو صاف کر کے رہیں گے





(طابع وناشر حمید پریس دہلی)